رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ   جلد ۴۳ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے   قیمت فی پرچہ دس آنے

اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر
(دوسرا ایڈیشن)

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن سات سال گذرنے کے بعد بھی ابھی ایک گروہ — برسر اقتدار گروہ — اس ملک میں ایسا موجود ہے جو شرح صدر کے ساتھ اسلام کو اس ملک کی اساس بنانے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دین کو سیاست سے کیا تعلق وہ تو صرف عبادات و عقائد کے معاملات میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں آج تک کسی ریاست کی بنیاد قرآن و سنت پر نہیں رکھی گئی۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تو اس ملت کے لئے تعمیر و ترقی کی راہیں مسدود ہو جائینگی۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر کے عنوان سے دو مقالات میں اس طرح کے تمام اعتراضات و شبہات کا مسکت جواب دیا ہے اور وہ تدابیر بتائی ہیں جن کے ذریعہ پاکستان کو ترقی یافتہ مثالی اسلامی مملکت بنایا جا سکتا ہے۔ ۸۸ صفحات قیمت ایکروپیہ

ذمیوں کے حقوق (نئی کتاب)

اسلامی ریاست پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسمیں تمام شہریوں کو یکساں حقوق نہیں دیئے جاتے اور غیر مسلموں کو ذمی قرار دیکر گویا اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اپنے مخصوص، مدلل، سلجھے ہوئے دلنشین انداز میں اپنے مضمون "ذمیوں کے حقوق" میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ذمیوں کے حقوق کی طویل فہرست پیش کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی ریاست میں بسنے والی اقلیتوں کو جو حقوق ملتے ہیں وہ دنیا کی موجودہ ریاستوں کی طرح محض کاغذ پر نہیں دیئے جاتے بلکہ انکے تحفظ کی ذمہ داری خود اللہ اور اسکے رسول نے لی ہے اور آج عملاً کسی اصولی ریاست میں اقلیتوں کو اتنے تحفظات حاصل نہیں جتنے اسلامی ریاست میں انہیں حاصل رہے ہیں۔ ۵۶ صفحات قیمت دس آنے

مسئلہ ملکیت زمین (دوسرا ایڈیشن)

ہمارا ملک چونکہ زراعتی ملک ہے اسلئے یہاں زمین کی ملکیت اور مزارعت سے متعلق نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں ایک گروہ کا خیال ہے کہ زمین کی انفرادی ملکیت ختم کرکے اسے "قوما" دیا جائے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جاگیروں اور زمینداریوں کا وہی نظام برقرار رہنا چاہئے جو انگریز سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے اور یہ دونوں گروہ اپنی تائید میں قرآن و سنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے کسی خاص نقطہ نظر کی تائید یا تردید میں قرآن و سنت سے دلائل لانے کے بجائے ملکیت زمین اور مزارعت کے بارے میں خالص قرآن و سنت کا نکتہ نظر پیش کیا ہے اور اسکی روشنی میں ان دونوں گروہوں کے نظریات پر تنقید کر کے صحیح راہ عمل متعین کی ہے۔ ۱۲۰ صفحات قیمت ایکروپیہ چارآنے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۳	ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ - مطابق جنوری ۱۹۵۵ء	عدد ۴

اشارات	نعیم صدیقی	۲
الاخوان المسلمون اور مصر کی فوجی حکومت	ملک غلام علی	۵۰
اسلام اور ہمارا قانونی نظام	عبدالقادر عودہ شہیدؒ	۶۷

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

روزنامہ "ٹائمز آف کراچی" نے اپنا ایک مطبوعہ اداریہ (مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۵۴ء) "ترجمان" میں اشاعت اور تبصرے کے لیے بھیجا تھا۔ اس اداریے پر ہمارا مفصل تبصرہ "تسنیم" میں شائع ہو چکا ہے۔ روزنامہ مذکور کے مدیر شہیر نے، نیز محکمہ تعلقات عامہ پنجاب نے اس اداریے کی پریس میں وسیع پیمانے پر اشاعت کی کوشش کی ہے۔ ہم اس اداریے پر اپنے جوابی تبصرے کو "ترجمان" میں بھی نقل کر رہے ہیں تاکہ ہمارے نقطۂ نظر سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔ ہم پہلے ٹائمز آف کراچی کے اداریے کا وہ "مستند" ترجمہ دیں گے جسے محکمہ تعلقات عامہ نے اخبارات کو مہیا کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ بعد میں اپنا تبصرہ نقل کیا جائے گا۔

ٹائمز آف کراچی کا اداریہ

(اسلام کے نام پر)

انجمن الاخوان المسلمون اور اس کے قائد جناب حسن الہضیبی جنھیں عمر قید کی سزا دی گئی ہے، کا المناک انجام غایت درجہ افسوسناک اور غم انگیز واقعہ ہے۔ لیکن اس سانحہ کا پس منظر پوری طرح سمجھنے میں حزم و احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ مسئلہ ایسے اخلاقی اصول کا مظہر ہے جسے عالم اسلام میں ہمہ گیر وسعت حاصل ہے۔

جب مغربی حاکمیت و تفوق میں ایک مدت کی گیرائی کے بعد تنزل پیدا ہونا شروع ہو گیا تو اسلامی تصورات کا از سرِ نو جنم لینا ایک فطری بات تھی۔ الاخوان المسلمون کا وجود اس نشاۃ ثانیہ کے مظاہرات کا ایک بین ثبوت تھا جس کی بنا پر اس جماعت کا قومی بیداری کی تحریک سے گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت دو لحاظ سے اسلام کے منافی تھی۔ ایک

اس معنی میں کہ اس نے اسلامی اسلوبِ فکر پر ایک غیر ملکی تمدن ٹھونسنے میں عامۃ المسلمین کے جذبات کو کچلنے کی سعی کی، چنانچہ اس قسم کی تحریکوں نے ایران، انڈونیشیا اور دیگر ملکوں میں سر اٹھانا شروع کر دیا اور غیر ملکی اثر سے مخلصی پانے کے سلسلہ میں جنگ کے بعد عام سیاسی بیداری نے جو صورت اختیار کی اس کا خوشگوار ترین ثبوت پاکستان کے منصۂ شہود پر آنے سے ملتا ہے۔ جہاں تک برطانیہ سے مخالفت کا تعلق ہے پاکستان کے قیام سے نہ صرف قومیت کی تمنائیں اجاگر ہوگئی تھیں بلکہ اس کا وجود اسلام سے گہری شیفتگی کا مظہر بھی بن گیا تھا اور اس لحاظ سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری ہندوؤں کے مطالبہ آزادی سے جداگانہ حیثیت کی حامل تھی۔ اس قسم کی تحریکات غیر ملکی طاقتوں کے خلاف ایک بھرپور قوت پر مشتمل تھیں لیکن غیر ملکی اقتدار کے اٹھ جانے کے بعد ان تحریکوں نے انتہائی اہمیت کے معاشرتی معاملات کو بھی اپنے حیطۂ اختیار میں لے لیا۔ شاہ فاروق کی تخت برداری پر، جو بدعنوانیوں اور غیر ملکی مفادات کا نقیب بن گیا تھا، عوام کی طرف سے بجا طور پر قومی جشن منایا گیا۔ اس موقعہ پر انجمن الاخوان المسلمون فوج کی حلیف بن گئی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس انقلاب کے علمبردار اخوان ہی قرار دیئے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج نے مصر میں انقلاب لانے کے لیے اس جماعت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں جناب حسن الہضیبی کو ملکی حالات و واقعات پر اپنا بے پناہ اثر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات کی موجودگی میں وہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہوا جس کی خواہش اور توقع کی جاتی تھی؛ وہ کیا چیز ہے جس نے انجمن الاخوان المسلمون اور انقلابی کونسل کو ایک دوسرے سے دست بگریباں کر دیا اور اس باہمی آویزش سے ملک کے اندر طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا اور بیرونی ممالک میں اس کے وقار کو شدید ضرب پہنچنے لگی۔

بادی النظر میں اس دھاندلی کا سبب نہر سویز کا قضیہ ہے۔ کرنل ناصر نے حکومت برطانیہ سے جو معاہدہ طے کیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ ملکی مفادات کے منافی ہے لیکن اس سلسلہ میں جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ محض جذباتیت کے آئینہ دار ہیں۔ کیا کوئی بھی ایسا انسان ہے جو یہ چاہتا ہو کہ وہ دوسروں کی غلامی میں رہے یا عزتِ نفس کی نعمت سے محروم ہو کر کسی دوسرے کا مطیع و منقاد ہو جائے؟ لیکن سیاست اور ڈپلومیسی میں اس بات کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ موقع شناسی اور سیاسی تدبر کے ماتحت مصری حکومت نے بدترین حالات میں بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اگر مصری اس قابل ہوتے کہ وہ ملک سے انگریزوں کو نکال باہر کرتے تو اتنی مدت تک محض

لفاظی اور استدلال میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اقوام متحدہ نے بھی اس صورتِ حال کی اصلاح میں کوئی قابل ذکر مدد نہیں کی۔ ایسے نامساعد حالات میں کرنل ناصر نے مصر سے برطانیہ کے اخراج میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ بجائے خود ایک شاندار کارنامہ ہے۔ عام طور پر اس معاہدہ کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر وسیع پیمانے پر دوبارہ جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ دوسری مغربی طاقتوں کی حمایت و اعانت سے نہر سویز کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے لیکن یہ تو ایسی بات ہے جیسے روس کی طرف سے حملہ ہونے پر امریکہ اپنی فوجیں برطانیہ، فرانس یا جرمنی کی امداد کے لیے ان ملکوں میں داخل کر دے۔ اکیلا مصر اپنی مدافعت نہیں کر سکتا اور یہ مصر ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی ملک اپنی حفاظت خود کرنے کا اہل نہیں تا وقتیکہ وہ غیر جانب دار رہنے کا متمنی نہ ہو لیکن لفظی دعووں اور جنگ سے الگ تھلگ رہنے کی خواہش کے باوجود کسی ملک کا غیر جانب دار رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ اسلامی مفادات کے نقطۂ نظر سے ایسا کرنا موزوں بھی نہیں ہے۔ مغربی ممالک اور اشتراکی دنیا کے درمیان جنگ چھڑ جانے پر فرزندانِ اسلام کے انتخاب کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ خواہ ہم ان دونوں طاقتوں میں سے کسی ایک کا حلیف ہونا پسند کریں یا نہ کریں۔

اس مطمح نظر کے علی الرغم مذکرہ معاہدہ کی رو سے مصر میں صنعتی ترقی اور اندرونی استحکام جیسے ضروری مقاصد کے لیے راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ زیر نظر معاہدہ کے مطابق مصر کو بین الاقوامی معاملات میں ایک وسیع حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس معاہدہ کے فوائد سے مصر کہیں زیادہ متمتع ہو سکتا ہے۔

الاخوان المسلمون نے جس خونی مگر خیالی معرکے کا خدشہ ظاہر کیا ہے وہ نہر سویز کے معاہدہ کے قضیہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ عوام کے احساسات اور اصل حالات سے ناواقفیت کی بنا پر یہ مسئلہ کسی وقت بھی مصر کی موجودہ حکومت پر اعتراض یا نکتہ چینی کرنے کے لیے سب کو متحد و ہمخیال بنانے کے لیے ایک بہترین موضوع قرار پا سکتا ہے۔ اس قسم کا تنازعہ کھڑا کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے ؟ ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ انقلاب مصر کے آغاز میں الاخوان المسلمون کی جماعت نئی حکومت کے حامیوں میں سے تھی اور یہ جماعت ان واقعات کے رونما ہونے تک نئی حکومت کا ساتھ دیتی رہی جو امسال مارچ کے دوران جنرل نجیب اور کرنل ناصر کے درمیان پہلی جھڑپ پر منتج ہوئے۔ انقلابی حکومت اس جماعت کی ہدایت اور راہنمائی قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس جماعت کا میدان سیاست میں کوئی حریف نہ رہا تھا پھر وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے جماعت اور اس کے قائد کو اپنا پروگرام بروئے کار لانے کا موقع نہ دیا۔ حیرت ہے

کہ نہر سویز کے معاہدہ کے سوا جسے پوشیدہ اغراض کے حصول کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، حکومت الاخوان المسلمون کے مابین تنازع یا جھگڑے کے متعلق کبھی کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔ اس پس منظر کی موجودگی میں حکومت اور اخوان کا تصادم غیر ضروری بلکہ بے معنی ہوتا ہے اس معاہدہ پر جس قدر غور کیا جائے الاخوان المسلمون کی طرف سے منفی رویہ اختیار کرنے میں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

اس باب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا نزاع سیاسی اقتدار کے حصول کا ہے۔ حسن الہضیبی چاہتے ہیں کہ اقتدار و اختیارات کی عنان ان کے ہاتھ میں آجائے۔ مصر اور مصری حکومت کو اس مسلح بغاوت کا سامنا کرنا پڑا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ اقتدار اور قوت حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے اس قسم کے دہشت انگیز طریقے انتہا پسند اور بزعم خود مبنی بر صداقت تحریکوں کے مزاج میں رچے ہوتے ہیں۔ ایسی تحریکیں اعتدال پسندی، فراخدلی اور مصالحت کے جذبہ سے خالی ہوتی ہیں حالانکہ یہی جذبہ قومی تعمیر و ترقی کے بتدریج اور صبر آزما مساعی کا سرچشمہ ہے جس کی بدولت ملک مغربی ثقافت سائنس اور سیاست کی عظیم روایات سے کماحقہ، مستفیض ہو سکتا ہے۔

آپ ہی کہیئے ایسی کون سی حکومت ہوگی جو بغاوت کو برداشت کرلے گی۔ لہذا کرنل ناصر کی حکومت نے جو کچھ کیا ہے وہ ناگزیر تھا کیونکہ اس حکومت کے لیے ہر حالت میں اپنی مدافعت کرنا ضروری تھا۔ موجودہ صورت حال کا سارا الزام ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے ملک کے وسیع مفاد کی ذرہ بھر پروا نہ کی اور جن کے خیال کے مطابق ان کی دیانت وایمان داری کے حصار ہی میں اسلام کی ترقی و سربلندی محفوظ تھی۔ حالانکہ یہ لوگ قومی نظریات کی برتری کے زعم میں ملک کو افراتفری اور لاقانونی کے غار میں دھکیل دینے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ کچھ افراد کے دردناک انجام سے قطع نظر مصر کے عام بہی خواہ بالخصوص اسلامی ممالک میں مصر سے یکسگالی کا جذبہ رکھنے والے اصحاب موجودہ مصری حکومت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے سے کیسے باز رہ سکتے ہیں۔ ہم مصر کو زندہ و سلامت اور دن بدن طاقت ور ملک دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔

مصر میں حالات نے جو نہج اختیار کی ہے، وہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن میں بعض افراد نے جماعتی شکل میں اپنے مذہبی اور اخلاقی عقائد کی دھن میں ایک باقاعدہ اور منظم نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا لیکن اس قسم کی کوششیں کبھی مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کے اقدام سے اگر کبھی ایک حکومت کی بجائے کسی

دوسری حکومت نے جگہ لی تھی، تو اس سے خیالات نے کوئی دائمی اثر قبول نہیں کیا، جو سماج، رواداری اور فراخ حوصلگی کی تلقین کرتا ہے، اس کی مساعی ہمیشہ بار آور ہوتی ہیں، اس طرح کے سارے معاشروں میں رواداری کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اور وہاں معاشرتی تصورات خیالات کے باہمی تبادلے اور تاثر سے تغیر پذیر ہوئے ہیں، اس کی مثال برطانیہ کے معاشری وسائٹیز ہیں، جن میں مسلسل تغیر ہوتا رہا ہے۔ یہ تغیر معاشری اور اخلاقیاتی تفکر کے تازہ ترین اثرات کی روشنی میں وجود میں آتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں بڑے حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ پاکستان کو بھی اس قسم کی پر جوش اور گمراہ کن تحریکوں کا اندیشہ ہے۔ یہاں بھی مبینہ مذہبی بنیادوں پر شورشیں برپا کی جا چکی ہیں۔ جن کا نتیجہ سخت تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک کی اصلیت کچھ بھی ہو لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ اس تحریک نے حکومت کے خلاف ایک کھلی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس تحریک نے تمام پنجاب میں ہلچل پیدا کر دی اور صوبے کا سارا انتظام متزلزل ہو کے رہ گیا۔ جس کے ساتھ قتل و غارت گری اور بہیمانہ کارروائیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اور جائیداد کا بھی زبردست نقصان ہوا۔ اس تحریک کے حسن و قبح کو جانچنے کا یہ معیار نہیں ہے کہ اس میں کسی نظریہ یا عقیدہ کا سوال پیدا ہو گیا تھا، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ملک کس حد تک متاثر ہوا؟ کسی منظم اور مربوط معاشرے میں کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے عقائد کے افراد پر اپنے خیالات اور عقائد جبر یہ ٹھونس دے۔ یہ ضروری ہے کہ جملہ تحریکیں آئینی مساعی تک ہی محدود رہیں، کسی مہذب سوسائٹی کے نزدیک ہر اس تحریک کو برا خیال کیا جاتا ہے جو ملک کی تباہی کا موجب ہو، خواہ اس کے مقاصد اپنی جگہ کتنے ہی مخلصانہ کیوں نہ ہوں قتل بہر حال قتل ہے، خواہ یہ محبت و خلوص کے جذبہ سے ہو یا عناد و کینہ کے ماتحت عمل میں آئے۔

ہمارے ملک میں اسلامی مملکت کے تصور اور تشکیل کے متعلق کافی بحث جاری رہی ہے، یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمان کچھ اس قسم کی مملکت چاہتے تھے ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ وہ اس کے حصول کے لیے نبرد آزما رہے ہیں، انہوں نے اس کے لیے مشکلیں برداشت کیں، اور قربانیاں دی ہیں، پاکستان میں غیر مسلم فرقے موجود ہوں یا نہ ہوں۔ یہ مملکت بدرجۂ اتم ایک اسلامی مملکت ہے کیونکہ اس مملکت کا قیام مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کے عزم و استقلال سے عمل میں آیا ہے۔ اس اصطلاح کا وسیع تر مفہوم بھی یہی ہے اس پر کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ پر بحث و تمحیص اور

اور لے دے ہوتی رہی ہے، مگر معمولی حد تک۔ اس ضمن میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کا وسیع اور عام الفاظ میں یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ کوئی ایسی مملکت جس پر مسلمان حکمران ہوں، وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ علمی، شعوری اور آئینی اصطلاح میں اس قسم کا مسئلہ خالصتاً رائے اور ذاتی نقطۂ نظر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ اسلام میں کلیسائی نظام کا وجود نہیں، اس لیے اس کی سیاست میں مذہبی پیشواؤں کا ادارہ بھی نہیں جسے ایسے مسئلے پر فتویٰ دینے کی پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ عوام زیادہ سے زیادہ علماء کے علم و فضل سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ مولانا[1] مودودی یا مولانا[1] احتشام الحق کی قسم کے لوگوں کے اس دعوے سے عام گڑبڑ پیدا ہوئی کہ ان کی رائے مستند اور صائب ہے جس کے سامنے لوگوں کو سر تسلیم خم کردینا چاہیے۔ اس قسم کے مذہبی علما کے کئی مکتبِ خیال ہیں جو ایک دوسرے سے باہم برسرپیکار رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ایک گروہ یا دوسرے گروہ کی رائے واجب التعظیم اور ثقہ کیوں تسلیم کی جائے، جب کہ اسلام اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ہماری سوسائٹی جیسے وسیع الخیال معاشرے کے لیے جو ملائیت کے بندھنوں سے آزاد ہے یہ کہیں موزوں ہے کہ اس مسئلہ کو اصول اجماع کے مطابق عام مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے اور ان لوگوں کی مداخلت سے جو اس مسئلہ پر کامل دسترس رکھتے ہوں، عوام کے مختلف عقائد پر مائل کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کیے جانے کے سوال پر بحث اس لیے پیدا نہیں ہوئی کہ اس کی موزونیت پر کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ اسلامی مملکت کی صحیح تشکیل کے سلسلہ میں جو اجارہ دارانہ نوعیت کے مطالبات پیش کیے گئے تھے ان پر بحث مباحثہ شروع ہوگیا تھا۔ اس شور و شغب میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ یہ اسلوب فکر ملک کے لیے تباہ کن نتائج کا حامل ہے، عوام کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایک مشورہ یا دوسرے مشورہ پر کان دھریں یا ان میں سے کسی ایک کو ٹھکرا دیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ آخری اختیار عوام ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام کے متعلق مشترکہ اور متحدہ طور پر رائے زنی کرنے اور افہام و تفہیم کے لیے موجودہ وقت کے پارلیمانی اداروں میں بحث مباحثے کے بہتر مواقع میسر آسکتے ہیں۔ اس بحث سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں ہمارے خیال میں ایک مسلم معاشرے میں کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ مختلف عناصر کو مجتمع کرنے کی غرض سے اسلام کے نام پر سیاسی جماعتوں کو معرض وجود میں لائے۔ خواہ ان جماعتوں کا پروگرام سماجی اور اخلاقی بہبود کے اسلامی مقاصد سے آراستہ کیا جاسکتا ہو۔ سیاست میں

[1] "مولانا" کا لفظ سلہری صاحب کے ادارئیے میں نہیں ہے، معلوم نہیں ترجمے میں یہ اضافہ کس لیے کیا گیا ہے (ترجمان)

یہ عام بات ہے کہ سیاسی جماعتیں نکتہ چینی، باہمی آویزش اور دشنام طرازی میں مصروف ہیں۔ انگلستان میں ٹوری جماعت سوشلسٹوں کو فتنہ پرداز، بدامنی پسند اور ہیچو قسم کا مورد قرار دے سکتی ہے اور اس کے جواب میں قدامت پسندوں پر یہ طنز کی جا سکتی ہے کہ وہ تنگی القلب، سرمایہ پرست ہیں۔ اب بتائیے کہ جماعت اسلامی جیسی کوئی جماعت اسلام کا پرچم اٹھائے اپنے مخالفوں کو کس نام سے یاد کر سکتی ہے۔ یہی نا کہ جو لوگ اس جماعت کے حلقہ بگوش نہیں انہیں کافر، ملحد وغیرہ کے خطابات سے نوازا جا سکتا ہے اور حقیقت میں اس قسم کی اصطلاحات کا استعمال جماعت اسلامی کی طرف سے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس جماعت کے ترجمان نے ان لوگوں کو اس قسم کے خطابات سے یاد کیا ہے جو موجودہ دستور میں ترمیم کے خواہشمند تھے۔ مسلم معاشرے میں ایسی صورتِ حال کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ جماعت اسلامی ان اشخاص کو خارج از اسلام قرار دیتی ہے جو اس کے حلقۂ رکنیت میں داخل نہیں۔ اس نظریئے کی قانونی طور پر ممانعت کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ پابندی ان مذہبی اور تعلیمی اداروں یا جماعتوں پر عائد نہیں کی جانی چاہیے جن کا مقصد و مدعا یہ ہو کہ عوام کو اسلام اور اس کی قدروں سے روشناس کرایا جائے۔ ہمارا اعتراض صرف سیاسی جماعتوں کے متعلق ہے۔

دوسرا نتیجہ اس بات پر اثر انداز ہوتا ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یعنی کسی ایک کی رائے دوسرے سے زیادہ قابلِ قبول کیوں ہو؟ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو علمیت موجود ہے اس کی سند اور معیار کیا ہے۔ رائے اور نظریہ بہت حد تک ماحول پر منحصر ہوتا ہے غیر ملکی حکومت لازماً ذہنوں کو متاثر کرے گی۔ لہذا یہ شاذونادر ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں قطعاً آزادانہ روش کے مفکر پیدا ہوں۔ اقبال ایک ایسے مفکر ہیں وہ ہر شئے پر ایک وطنی مسلم زاویئے سے نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی اعانت ایک اور حقیقت بھی کرتی تھی۔ اور وہ مغربی تمدن کی روح سے ان کی کامل آگاہی اور اس کا لامحدود علم تھا۔ اسلامی مقامات نظر کی پوری روشنی رکھتے ہوئے وہ مغربی اقدار کو نہایت آزادانہ طریقے سے پرکھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عمر بھر مذہبوں اور تمدنوں کا مطالعہ و موازنہ کیا، وہ جن نتائج پر پہنچے وہ قطعاً ان کے اپنے تھے۔ اس پر بھی انہوں نے بالوضاحت یہ بات کہی ہے کہ دوسرے لوگ جو زیادہ اہلیت کے مالک ہو سکتے ہیں، نئے مقامات نظر سے آغاز کریں۔ لہذا دو شرائط مستند رائے دینے کے لیے ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم چونکہ ابھی غیر ملکی حکومت سے آزاد ہوئے ہیں اس لیے اس کے سیاسی و فکری اثرات ابھی باقی ہیں۔ جو لوگ ہم میں

بہت ممتاز ہیں وہ یہی کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی مغربی عالم کا حوالہ دے چھوڑتے ہیں۔ بالعموم حالت یہی ہے لیکن جو لوگ مستند رائے رکھنے کے دعوے دار ہیں، ان کا نقد علم بہت ہی کم ہے۔ مثلاً کسی مودودی یا احتشام الحق کا سرمایۂ علم کتنا ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی شخص یقینی طور پر نہیں بتا سکتا کہ وہ اپنے حلقۂ علم میں کتنی استعداد رکھتے ہیں لیکن وہ وقت کے تقاضوں سے یقیناً اور قطعی طور پر بے بہرہ ہیں جس میں وہ زندگی گذار رہے ہیں اور جس میں ہمارا اسلامی معاشرے کا تجربہ جاری ہے۔ قرآن کریم کو محض عربی زبان ہی میں نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اس کے ادراک کے لیے انسان کے تمام ذخیرۂ علم اور روز افزوں معلومات کی روشنی درکار ہے کیونکہ یہ مقدس کتاب انسانی معاملات پر روشنی ڈالتی ہے جن کے پیچھے اس کی روحانی حقیقت پس منظر ہونا چاہیے۔ اسلام کا ادراک اتنے ذخیرہ علم کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسے ایک معاشری اور سیاسی نہج پر ڈالنا تو اور بھی دشوار ہے۔

لہذا ہمارا مشورہ یہی ہے کہ ہمیں آج کی دنیا کو سمجھنے میں استقلال اور مسلسل کاوش سے کام لینا چاہیے۔ جوں جوں وقت گزرے گا اور ہمیں اپنی سیاسی آزادی میں زیادہ اعتماد اور ادراک حاصل ہوگا، ہم آراء قائم کرنے کے زیادہ اہل ہوں گے۔ فی الحال ہم جس بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی اساسی وحدت پر یقین رکھتے ہوئے علم جدید حاصل کیا جائے کیونکہ اسلام مادی اور روحانی، دنیاوی اور سماوی اشیا کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب ایسے علم سے آراستہ لوگ زیادہ تعداد میں پیدا ہوں گے تو معاشرے پر لازماً ان کا اثر ہوگا جس سے مجلس قانون ساز بھی خارج نہیں۔ جو بلند تر ہوتے ہوئے تفکر کے درجہ کے مطابق بنائے گی جس طرح معاشرہ افراد کی تگ و دو سے بہتر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ افراد کی فراست سے زیادہ باشعور بھی ہو جائے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عمل کا اجرا کریں کیونکہ ہمیں علم کی بے حد ضرورت ہے۔ قومی ترقی کے اس مرحلے پر ہمیں جو اپنا فرض سمجھنا چاہیے وہ اول تو یہ ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کے لیے ایک مضبوط اور ہر اعتبار سے مجتمع ملک چھوڑیں۔ دوسرے انہیں علم کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ دیں جو ان کے کام آئے۔ بجائے اس کے کہ انہیں محدود فہم اور محض جہالت سے پیدا شدہ بندھی ٹکی آراء دے دی جائیں۔ ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم آئندہ نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین میں جکڑ دیں جو نیم پختہ خیالات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ وہ شخص جو ہمارے علماء کو انکسار کا درس دے گا اسلام کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔

اداریے پر تبصرہ

یہ تحریر بہت سی متفرق اور ادھوری بحثوں کی جامع ہے۔ بڑی محنت سے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم ان متفرق بحثوں کو چار حصوں میں بانٹ سکے ہیں۔ ایک حصے میں سلہری صاحب نے مصر کی افسوسناک صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور یہ جائزہ چند اہم نتائج تک پہنچنے اور پاکستان کے لیے بیش قیمت سبق حاصل کرنے کے ارادے سے لیا ہے۔ دوسرے حصے میں پاکستان کی نظریاتی فضا کا تجزیہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ یہاں بھی من وعن وہی صورتِ حالات سامنے ہے جیسی کہ مصر کو درپیش ہے، لہٰذا اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کچھ ویسی ہی تدابیر عمل میں لانی پڑیں گی جیسی مصر میں لائی جا رہی ہیں۔ تیسرے حصے میں اسلامی ریاست کے تصور پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے اور پاکستان کن معنوں میں اسلامی ریاست ہے۔ چوتھے حصے میں جماعتِ اسلامی پر خاص نگاہِ کرم فرمائی گئی ہے اور اربابِ اقتدار کو مشورہ دیا گیا ہے کہ اس "خطرے" سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا اقدام ضروری ہے۔ اسی ترتیب سے ہم بحث کے ایک ایک حصے پر اپنا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

(۱)

مصر کی فوجی آمریت اور اخوان اخوان آج جس انتہائی مظلومانہ ابتلا میں سے گذر رہے ہیں اس کی اتنے بڑے پیمانے کی کوئی مثال نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنی تاریخ کے نہایت افسوسناک ادوار تک میں نہیں ملتی، بلکہ ایشیائی، خصوصاً مسلمان ممالک پر مغربی قوموں کے جابرانہ سامراج نے بھی پچھلی دو صدیوں میں ایسے بے باکانہ استبداد کی کوئی نظیر قائم کر کے نہیں چھوڑی۔ خود اس خطۂ ہند میں برطانیہ نے ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت کی باگ ڈور چھیننے میں بڑی سخت سخت کارروائیاں کی ہیں لیکن ان غیروں نے بھی اس کارنامے کی ٹکر کا کوئی خونین کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس سے آج اپنوں نے تاریخ کو مالا مال کر دیا ہے۔ اس سانحۂ عظیم پر چونکہ کرۂ ارض کے ہر گوشے میں مسلمانوں کے زخمی کلیجوں سے خون ٹپک رہا ہے اس لیے دنیا بھر میں یہ واقعہ سیاست اور صحافت کے میدانوں میں نمایاں ترین موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطعِ نظر کیجیے کہ مصر کی فوجی آمریت اور اخوان میں سے کون حق پر ہے اور کون

برسرِ غلط ہے، یا دونوں قصوروار ہیں تو کس کا حصہ کتنا ہے۔ بلکہ اُلٹا یہی طے کر لیجیے کہ اخوان مجرم ہیں، سو فیصدی مجرم ہیں اور ناقابلِ عفو مجرم ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عدل و انصاف کے کم سے کم معیار کا جو تصور انسانیت کے اجتماعی ضمیر میں پیوست ہے، کیا اس معیار پر مصر کی آمریت کے اقدامات پورے اترتے ہیں اور دیکھنے والا مطمئن ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آمریت — اور فوجی آمریت — کا تخت بچھا ہے اور اس پر ایک طاقت جلوہ فرما ہے جس کی محض اپنی مرضی دستور، جس کا صرف اپنا ہی حکم قانون، اور جس کا فقط اپنا ہی فیصلہ پالیسی قرار پاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آمریت "ہنگامی حالات" کے جس اعلان سے دستوری اور جمہوری فضا کا خاتمہ کرتی ہے اسے ایک لمبے عرصے کے لیے ملک کی تقدیر بنا دیتی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رائے عام کی ترجمانی کر سکنے والی تمام پارٹیاں میدان سے ہٹا دی جاتی ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اختلافی نقطۂ نظر رکھنے والے اخبارات تمام کے تمام بند کر دئے جاتے ہیں اور پریس پر مستقل سنسر بٹھا دیا جاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے دہشت ناک ماحول میں اخوان کو محض نقطۂ نظر کے اختلاف کی بنا پر موجودہ واقعات سے بہت قبل کھلی کھلی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ گویا یہ بات موجودہ واقعات سے قبل طے ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کو ختم کرنا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خلاف مختلف الزامات عائد کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، درآنحالیکہ وہ تردید کرنے کے لیے ذرائع و وسائل سے محروم ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اخوان کو کسی عدالتی فیصلے کے بغیر خلافِ قانون قرار دے کر کثرت سے گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں۔ لیکن اتنے بھرپور وار سے خیالات کی وہ رَو نہیں تھمتی جو اخوان کی تحریک نے کئی برس کی محنت سے پیدا کی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں ناصر پر ایک انوکھے انداز سے قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس کی شاید کوئی ایک نظیر بھی قاتلانہ حملوں کی تاریخ میں نہ مل سکے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عین حملے کے وقت ناصر پکارتے ہیں کہ "پکڑو، یہ کوئی اخوانی ہے۔" پھر چند گھنٹوں کے اندر اندر طے ہو جاتا ہے کہ اس حملے کے پیچھے ایک وسیع سازش کام کر رہی ہے۔ چنانچہ دل کھول کر گرفتاریاں کر لی جاتی ہیں

اور سرکاری انتظام سے اخوان کا مرکزی دفتر نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے، اور ایسی نرالی فوجی عدالت بٹھائی جاتی ہے جس کی قضا کی مسند پر خود ہی وزرائے کرام جلوہ فرما ہوتے ہیں جو برسرِ عام اخوانیوں کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار پہلے سے کرتے رہے ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عدالت آدھ آدھ گھنٹے کی کارروائی کر کے اخوان کے اہم ترین افراد کو خوب دل کھول کر پھانسی اور عمر قید کی سزائیں سناتی ہے۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی شائبہ رحم سے کام لئے، یا مسلمانانِ عالم کے جذباتِ ملی کا کوئی لحاظ کئے، پوری شانِ سنگدلی کے ساتھ جلد جلد یہ سزائیں نافذ کر دی جاتی ہیں۔

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظلم کی اس چکی میں پسنے کے لیے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھیپ ان لوگوں کی لائی جانے لگتی ہے جن کو اخوان ہونے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔

یہ ساری صورتِ حالات جس کا ایک ایک جزو ایسا ہے جو اسلام، جمہوریت اور عام انسانی تصورِ انصاف سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے، ہر پیکرِ آب و گل کو — بلا لحاظ اس کے کہ وہ اخوان سے اختلاف رکھتا ہو یا اتفاق کرے — سر سے پاؤں تک ہلا ڈالنے والی ہے۔ ایسے واقعات انسانیت کی پچھلی تاریخ میں ہو گزرے ہوں، یا آج پیش آ رہے ہوں، مسلمان ان سے دوچار ہوں یا غیر مسلم، کمیونزم کے زیر اقتدار نمودار ہوں یا سرمایہ داری کی چھاؤں میں، مشرق میں ہوں یا مغرب میں، ہمارے دوستوں کو ان سے سابقہ پڑے یا مخالفوں کو، انسانی فطرت ہر صورت میں ان پر یکساں کرب محسوس کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ایسی ہی صورت ہے جیسے آپ کے محلّے کا کوئی آدمی حویلی کا دروازہ بند کر لے، اپنے کسی ماتحت شریکِ کار کے ہاتھ پاؤں باندھ لے، اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دے اور پھر خود ہی الزام لگانے والا مدعی ہو، پھر خود ہی قاضی بن کر ایک سزا سنائے، اور آخر میں خود ہی جلّاد بن کر کوڑوں سے اس کی چمڑی ادھیڑنے کے درپے ہو جائے۔ محلّے میں اپنے خلاف اضطراب پھیلنے کی روک تھام کے لیے وہ یہ تدبیر بھی اختیار کرے کہ اپنے نوکروں کے ذریعے پرچے لکھ لکھ کر اپنے حق بجانب ہونے اور شریکِ کار کے سنگین مجرم ہونے کے دلائل ان کو فراہم کرے۔ اگر آپ کے اپنے پڑوس میں کسی فرد کو اس طرح کے ظلم کا شکار بنایا جا رہا ہو تو اپنے قلب کے بارے میں آپ کا اندازہ

کیا ہے کہ وہ پگھلے گا یا نہیں ؟ اس سے آگے بڑھ کر اگر یہی صورت کسی جماعت یا تحریک کو کسی حکومت کے نیچے پیش آجائے تو یہ ایک فرد کی مظلومی سے ہزاروں گنا وسیع دائرۂ اثر رکھتی ہے اور سوائے پتھر اور لوہے کے مجسموں کے اور کوئی اس پر بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مگر استثنٰی ہر عمومیت میں ضرور نکل آتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے اندر موجود ہیں جو اخوان کے لیے کسی جذبۂ ہمدردی سے بالکل خالی ہو کر مصری آمریت کے اس کارنامے کے لیے جواز کے دلائل پیش کرتے پھرتے ہیں۔ اکتفا اتنے ہی پر نہیں، اپنے اپنے قصرِ صحافت کی منڈیروں پر گھی کے چراغ جلا جلا کر اس طرح خوشی منا رہے ہیں کہ جیسے عمروں ترسنے کے بعد پہلی مرتبہ ان کے دلی ارمان پورے ہوئے ہوں۔ یہ پورے زورِ قلم سے مصری آمریت کو داد دے رہے ہیں کہ یہ تھا کرنے کا اصل کام جو تم نے جرأت مندی سے کر ڈالا۔ اور پھر اپنے حکمرانوں کے سامنے اسے اسوۂ حسنہ بنا بنا کے رکھ رہے ہیں کہ حضور! اسلام اور جمہوریت اور ملک اور عوام کی سب سے اونچی خدمات انجام دینے کے تو یہ ڈھنگ ہیں۔ یہ پوزیشن ابھی تک صرف ملت، الفضل اور سول اینڈ ملٹری گزٹ جیسے جرائد کی طرف سے ہمارے سامنے آئی تھی۔ ان جرائد کی پالیسی کے متعلق چونکہ ہماری ایک مستقل رائے ہے کہ وہ ایسے مذہبی فتنوں کو اپنے پس منظر میں رکھتے ہیں جو کبھی آدمی کو عالی ظرفی سے مالا مال ہونے کا موقع نہیں دیتے اس لیے ان کا اپنے جذبات کو سنبھال نہ سکنا کچھ عجیب نہیں لگا۔ مگر آپ کا یہ اداریہ پڑھ کر ہمارے اس حسنِ ظن کو کچھ نہ کچھ ٹھیس ضرور لگی ہے جو پریس کے روز بروز پستی کی طرف لڑھکنے کے باوجود ممتاز اخبارات کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔

اب آپ اپنے اداریے کا ایک بار خود ناقدانہ جائزہ لے کر دیکھئے۔ آپ پیرایۂ آغاز میں "اخوان المسلمون اور ان کے مرشدِ عام کا دردناک حشر" کے الفاظ سے بات شروع کرتے ہیں اور اس کو "دکھ اور کرب کا معاملہ" قرار دیتے ہیں لیکن کل ۲۶ الفاظ میں یہ سارا دکھ اور کرب پیش کر کے ساڑھے پانچ سطروں کے بعد آپ ایک "مگر" (BUT) استعمال کرتے ہیں جس کی سرحد سے آگے پورے کا پورا میدانِ بحث اخوان کے خلاف جمال ناصر اور اس کے اقدام کی حمایت کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ اس "مگر" کے بعد کہیں ایک رتی بھر "دکھ اور کرب" محسوس نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اظہارِ اطمینان کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس دکھ اور کرب کی داستان کو آپ جہازی صفحے کے چار لمبے لمبے کالموں میں لکھ گئے مگر عدل و انصاف کے اسلامی یا جمہوری اصولوں کی روشنی میں آمری اقدامات کا سرے سے

آپ نے جائزہ نہیں لیا۔ اس معاملے میں آپ نے دلیل کی بجائے تمام تر انحصار وجدان پر کیا ہے۔ بس یہ واقعات چونکہ آپ کو پسند آ گئے ہیں، لہٰذا وہ جس بھی اسلوب سے کر ڈالے گئے ہوں عین حق اور ہمہ صواب ہیں۔ پورا مضمون پڑھ جانے کے بعد خود بخود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر اوپر کے ان تمہیدی ۲۶ الفاظ کا اس تحریر میں مصرف کیا ہے۔

ایک ہی فریق ــــ اور غالب فریق، جس نے دوسرے فریق کا منہ بھی بند کر رکھا ہو ــــ کے دعویٰ کو من و عن لے کر اس پر رائے قائم کرنا اور پھر اپنے اداریے میں اسی یک طرفہ رائے سے پاکستان کے لیے ایک "درسِ عبرت" پیدا کرنا خواہ مخواہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ فاضل مدیر پہلے سے یہ درسِ عبرت اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور مصر کی تاریخ امروز کو انہوں نے اپنے رجحانات کے سانچے میں ڈھال کر ایک شئے معہود کے لیے استعمال کر ڈالا ہے۔ چنانچہ سارے کا سارا اداریہ بول بول کر کہہ رہا ہے کہ خود پاکستان میں ایسی دو طاقتیں ان کے سامنے ہیں جن میں سے ایک کو وہ اخوان کی جگہ رکھتے ہیں، دوسری کو ناصری آمریت کی جگہ اور پھر غیر جانب دار مبصر بن کر نہیں، بلکہ موخر الذکر طاقت کے وکیل بن کر کلام فرماتے ہیں:-

معاہدۂ سویز بہر حال اخوان اور ناصر کے اختلاف کا تجزیہ کرنے کے لیے سلہری صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آڑ کی حیثیت میں اخوان نے معاہدۂ سویز کے اختلاف کو استعمال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ سلہری صاحب کو اس سلسلے میں پوری صورتِ حالات کا علم نہ ہو سکا۔ واقعات یوں ہیں کہ معاہدہ کا سوال جب اٹھایا گیا تو اس وقت مصری موقف یہ تھا کہ پہلے علاقۂ سویز کو برطانیہ اپنی فوجوں سے خالی کر دے، پھر معاہدہ ہو سکے گا۔ لیکن برطانیہ جیسی گھاگ طاقت محض بیانوں اور درخواستوں سے تو اپنی روش نہیں بدل لیتی، وہ تو صرف طاقت کو مانتی ہے۔ مصر کے جنتا راج نے ضرورت محسوس کی کہ برطانوی فوجوں کے لیے مصر میں ٹکنا ناممکن بنا دیا جائے۔ یہ مہم اخوان کے سپرد ہوئی کہ وہ گوریلا وار کا سلسلہ شروع کر دیں۔ چنانچہ برطانیہ نے اس وقت معاہدہ کرنے کے لیے اپنی اکڑی ہوئی گردن کچھ نیچے کو جھکائی ہے جب اخوان نے علاقۂ سویز میں اس کے فوجیوں کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آخر جن لوگوں نے انگریز کو معاہدہ تک لانے کے لیے اپنا خونِ رگِ جاں پیش کیا تھا اس معاملہ میں ان کی دلچسپیوں کا گہرا ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ اخوان کی یہی گہری دلچسپی تھی جس کی وجہ سے خود برطانوی نمائندے نے محض ناصر سے گفت و شنید کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اخوان کے مرشدِ عام سے بھی براہِ راست گفتگو کر لینا ضروری سمجھا اور اس بارے میں خود ناصر سے بات بھی کر لی۔ مصر کی وہ

مقبولِ عام منظم طاقت جس نے برطانوی فوجی طاقت کے لیے امن چین کا سانس لینا حرام کر رکھا تھا، برطانیہ اس کے بارے میں مطمئن ہوئے بغیر کس طرح ایک کاغذی معاہدے پر انحصار کر سکتا تھا۔ شیخ حسن الہضیبی سے ایونز نے ملاقات کی درخواست کی۔ شیخ موصوف نے اس کی اطلاع فوراً کرنل ناصر کو دی۔ کرنل ناصر کے علم میں لا کر یہ ملاقات کی گئی۔ ملاقات کے بعد شیخ موصوف نے پوری رپورٹ بھی ناصر کو پہنچا دی۔ شیخ حسن الہضیبی یا اخوان کے نقطۂ نظر سے معاہدہ کی مجوزہ تشکل تمام تر برطانیہ کے مفاد میں جا رہی تھی۔ برطانیہ کو جو مقصد کروڑوں پونڈ کے سالانہ خرچ سے علاقہ سویز میں فوج رکھ کر حاصل تھا اب اس معاہدہ میں مصر کو باندھ لینے کے بعد بغیر اس خرچ کے حاصل رہے گا یعنی ترکیہ اسرائیل یا کسی دوسری حلیف عرب ریاست کے لیے خطرہ پیدا ہو جانے کی صورت میں برطانیہ اپنی بین الاقوامی ضروریات کے تحت مصر میں جب چاہے فوج اتار سکتا ہے اور حکومتِ مصر اس میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ اخوانی نقطۂ نظر یہ تھا کہ آئندہ جنگ کی صورت میں ہم برطانیہ سے ایک آزاد ریاست ہونے کی حیثیت میں تعاون کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اپنی آزادی اور ساورنٹی کو مستقل طور سے گرو نہیں رکھ سکتے۔ اخوان نے آخری درجے میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اس معاہدہ کی حتمی توثیق اس وقت تک عمل میں نہ لائی جائے، جب تک مصر کی ایک منتخب پارلیمنٹ اسے منظور نہ کر دے، اس سے قبل مصری عوام اور پریس کو اس معاہدے پر آزادانہ تبصرے کا حق حاصل رہنا چاہیے۔

مصر کی رائے عام، باوجود اظہار پر ہزار بندشیں ہونے کے صریحاً اسی اخوانی موقف کے حق میں تھی چنانچہ بعد میں جب ناصر اور ایونز کا گٹھ جوڑ ہو گیا تو فوج اور سول سروس کے حلقوں سے بے شمار قیمتی اور محب وطن اشخاص کو نکال باہر کرنا پڑا۔ یونیورسٹی کے حلقے سے چالیس پروفیسروں نے اس گٹھ جوڑ کے خلاف اظہار رائے کیا اور وہ سب کے سب نکال دیئے گئے۔ بہرحال جب ایونز اور ناصر اخوان کے بارے میں ناامید ہو گئے تو دونوں کے نزدیک یہ ناگزیر ٹھہرا کہ معاہدہ کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے مصر کی اس خیر خواہ طاقت کا قلع قمع کرنا ضروری ہے جس کی قربانیوں نے ناصر کے ہاتھ مضبوط کیے تھے اور اسے انگریز کو معاہدہ تک کھینچ لانے کے قابل بنایا تھا۔ جن لوگوں کے خون سے اس معاہدہ کے حروف لکھے گئے ہیں، آپ کس مزے سے ان کے بارے میں صحافت کی آرام کرسی پر بیٹھ کر یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ معاہدہ کو آڑ بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔

اخوان کے موقف پر فوجی آمریت کی جانب سے جرح کرتے ہوئے سلہری صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے

کہ کیا آدم کا کوئی ایسا بیٹا ہو سکتا ہے جو غیر کے سامنے جھکنے پر تیار ہو جائے؟" اس جرح کے جواب میں سب سے پہلے تو ہم یہ پوچھیں گے کہ کیا آپ نے اُس وقت بھی یہ سوال اٹھایا تھا جب مسلم لیگی حلقے جدوجہدِ پاکستان میں مولانا حسین احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت العلمائے ہند اور دوسرے کانگریسی کارکنوں کے بارے میں ہر ہر سانس یہ کہتے تھے کہ یہ سب ہندوؤں کے ہاتھ بک گئے ہیں؟ کیا یہ سوال آپ نے اس وقت بھی اٹھایا تھا جب شیخ عبداللہ کشمیری لیڈر کے بارے میں بچہ بچہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مسلمان قوم کے مفاد کے خلاف نہرو اور پٹیل سے سازباز کرلی ہے؟ دوسرے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری مسلم سلطنت کی اسی برعظیم کی تاریخ میں جعفر اور صادق کی طرح کے جو لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، وہ کیا انسانی نطفے سے پیدا نہیں ہوئے تھے؟ اس کے بعد ہم اس مسئلے میں روشنی حاصل کرنے کے محتاج ہیں کہ کیا دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ میں ایسے سودوں کی مثالیں بکثرت موجود نہیں ہیں جن میں مختلف سلطنتوں کے فرماں رواؤں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے قومی مفاد کو داؤں میں لگا دیا ہو، یا کم از کم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے کسی مالی امداد کے حاصل کرنے یا کسی وقتی مسئلے سے بچنے یا کسی قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی متاعِ آزادی وحاکمیت کو ہاتھ سے دے دیا ہو۔ کیا خود اسی نہر سویز کی پچھلی تاریخ اس بات کی شہادت فراہم نہیں کرتی کہ آدم کے ایسے بیٹے گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے مفاد کے خلاف دوسری قوموں سے معاہدے کیے ہیں؟ سلہری صاحب جیسے اخبار نویس کو اس سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی اقوام نے ایشیائی اور مسلم ممالک کو تلوار کے زور سے کبھی مسخر نہیں کیا، ہمیشہ ایسے معاہدوں کے جالوں میں پھانسا ہے جن میں ادنیٰ درجے کے فائدوں کے عوض وسیع پیمانے پر اپنے لیے مفاد حاصل کئے ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ کہاں بددیانتی نے کام کیا، کہاں حماقت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور کہاں محض کمزوری نے گُل کھلائے! سلہری صاحب دنیا کی ڈپلومیٹک تاریخ کے ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی بددیانتی، غداری اور حماقت کی دردناک داستانوں پر اپنے ایک سوالیہ جملے سے خطِ تنسیخ کھینچ دینا چاہتے ہیں۔

چلیے، ہم بغیر کسی بحث کے مانے لیتے ہیں کہ معاہدۂ سویز اپنی موجودہ شکل میں بہترین ہے، عوام کے مفاد سے اقرب ہے۔

ؔ۱ ابھی چند ہی روز پہلے ناصری آمریت نے علی الاعلان اخوان پر یہ بے تکا الزام لگایا تھا کہ وہ انگریزوں سے سازباز کر رہے ہیں، اور پھر حالیہ استبدادی مہم کے دوران میں ایک سازش پکڑنے کی خبر دیتے ہوئے اُس سے زیادہ نامعقول الزام یہ لگایا گیا کہ اخوان یہودیوں سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھے۔ کیا سلہری صاحب نے ان الزامات کے جواب میں اخوانیوں کی مدافعت کے لیے بھی ایسا کوئی سوال اٹھایا ہے؟ آخر وہ بھی تو آدم ہی کے بیٹے ہیں۔

اور انھوں نے اسے محض ایک آڑ بنا کر حصولِ اقتدار کی جدوجہد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مفیدِ عوام معاملات کو طے کرنے کے لیے آمرانہ استبداد کی ہولناک فضا پیدا کرنے اور رائے عام کا گلا گھونٹ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیوں نہ ایسے اہم اور پوری قوم کے نفع و نقصان سے تعلق رکھنے والے مسئلے کو ایک کھلی جمہوری فضا میں قوم کے سامنے رکھا گیا؟ کیوں نہ لوگوں کو اس پر اظہارِ رائے کے پورے پورے مواقع دئے گئے؟ کیوں اسے ایک ایسی فوجی ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے قطعیت سے طے کر دیا گیا جو محض ایک عارضی حیثیت سے دستوری زندگی کو معطل کر کے کام چلا رہی ہے اور جس کا کام صرف جمہوریت کے لیے راستہ صاف کر کے واپس اپنی بارکوں میں سمٹ جانا ہے؟ قوموں اور ملکوں کی قسمت کا سالہا سال کے لیے ایک یا چند افراد کا اس طرح کی خدائی حیثیت اختیار کر کے فیصلہ کر ڈالنا، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کدھر سے معقول ہے۔ اس بارے میں ہم سلہری صاحب کی رہنمائی کے بہت ہی محتاج ہیں۔

سلہری صاحب کا معاہدہ کی موجودہ شکل کے حق میں استدلال یہ ہے کہ چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں رہی اور داخلی استحکام اور صنعتی ترقی کے لیے بڑی بڑی مغربی طاقتوں کی امداد حاصل کرنا بالکل ناگزیر (BADLY NEEDED) ہے لہٰذا مصری آمریت نے اس مجبورانہ پوزیشن سے ممکن حد تک بہترین نتیجہ پیدا کر لیا ہے۔ اور پیشِ نظر معاہدہ نے مصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا ہے۔

اس استدلال کے مقدمات سے کسی نہ کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے۔ مثلاً یہ بات کہ آئندہ جنگ کے لیے جو دو دھڑے پیدا ہو گئے ہیں، ان میں سے ایک کی کمان کمیونزم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ہاتھ میں۔ ان دونوں میں جب بھی انتخاب کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بہت سے عوامل ایسے ہیں کہ جن کے تحت ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک کا رجحان کمیونزم کے مخالف دھڑے ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ غیر جانبدارانہ پوزیشن قائم رکھنے کا امکان اگرچہ موجود ہے لیکن عملاً یہ صورت مشکل سے نبھائی جا سکتی ہے لیکن سلہری صاحب کا ذہن جس طبقے کی وکالت کر رہا ہے اس کا نکالا ہوا یہ نتیجہ کہ اگر غیر جانبداری ممکن نہ ہو اور کسی ایک کے ساتھ لگنا ضروری ہو تو پھر سیدھے اچھل کر اس کے گھڑے کی مچھلی بن جانا چاہیے اور اس کے بعد اظہارِ اطمینان کرنا چاہیے کہ بس یہی بہترین صورت تھی جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ جس کے ساتھ لگو، پوری طرح آمنّا و صدقنا کہہ کر آزادی، خودداری، استقلال اور غیرت وغیرہ جیسی چیزوں کو اس کے قدموں میں ڈال دو۔

ڈپلومیٹک تاریخ ہزاروں مثالوں سے گواہی دیتی ہے کہ بڑی اور سربراہ کار طاقتوں کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ چھوٹی قوموں سے من مانے شرائط پر معاملات طے کریں۔ دوسری طرف چھوٹی قومیں پوری پوری تدبیریں اختیار کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی آزادی اور حاکمیت اور اپنے اہم مفاد کو بچا کر سمجھوتے کریں۔ چنانچہ آج بھی امریکہ و برطانیہ اس امر کے درپے ہیں کہ وہ کچھ ڈالر یا فوجی اسلحہ یا محدود سا بین الاقوامی تعاون قیمت میں دے کر چھوٹی چھوٹی نوخیز بالخصوص مسلمان قوموں کے اوپر بھرپور ہاتھ ماریں۔ ایسی صورت پیش آجانے پر اگر کسی نوخیز قوم کو مخلص اور بیدار مغز اور حقیقی ولولہ کار رکھنے والے حکمران نصیب ہو جاتے ہیں تو وہ ڈپلومیٹک دائرے میں اپنی مضبوط پالیسی کے ذریعے دوررس منصوبہ بنا کر لمبی کشمکش کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف قومی بقاء اور تعمیر و ترقی کا اصل دار و مدار اپنے عوام کی بیداری، تنظیم اور حرکت پر رکھتے ہیں، دوسری طرف اپنی ضروریات و مشکلات کے بارے میں کسی طرح کا اضطراب اور ان کو حل کرنے کی فکر میں کبھی غیر ملکی امداد کے لیے بے چینی دکھائے بغیر فیصلہ کن طاقت اپنی رائے عام کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ گاندھی جی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کبھی برطانوی حکومت کے نمائندوں سے گفتگو ہوتی تو گاندھی جی یہ کہا کرتے تھے کہ میں کیا کر سکتا ہوں فیصلہ تو کانگریس کے ہاتھ میں ہے، یا کہتے کہ میں تو مان جاؤں لیکن جنتا نہیں مانتی۔ گاندھی جی کی مثال تو دور کی ہے ہمارے اپنے ہاں قائد اعظم کی سیاسی بصیرت نے یہی روایت زیادہ شاندار طریق سے قائم کی ہے۔ موصوف نے جب کبھی بھی برطانوی وائسرائے یا کسی مشن سے گفت و شنید کی ہے تو ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ یہ اور یہ کچھ تو میری قوم کا مطالبہ ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا یا یہ کہ فیصلہ مسلم لیگ کی کونسل کے ہاتھ میں ہے، میرا کیا اختیار! یہ محض ایک ہتھکنڈہ نہیں ہوتا، درحقیقت ایک لیڈر یا حکمران جتنی اہمیت عوام کو دیتا ہے اور جتنی ساکھ اپنی قوم کی بناتا ہے خود اس کی اپنی اہمیت اور ساکھ اسی پیمانے پر مبنی ہے۔ ان طریقوں سے لیڈر اور حکمران ڈپلومیٹک دائروں میں معاملات طے کرنے کے لیے اپنی قوتِ معاملہ گری (BARGAINING POWER) کو بڑھاتے ہیں۔[1]

بخلاف اس کے جب باگ ڈور کسی نادان قیادت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے تو وہ اپنی ضروریات اور مشکلات کا

---

[1] یہی پالیسی کسی نہ کسی حد تک ہمارے ملک کے اندر مرحوم لیاقت علی خاں کے عہد تک برقرار رہی۔ اسی پالیسی نے ابتدائی چند سالوں میں پاکستان کی ساکھ اور اہمیت پیدا کی۔ لیاقت علی خاں کے بعد سے اکابر نے اپنی پالیسی کو کمزور کرنا شروع کیا۔ اور اب جہاں نوبت پہنچ گئی ہے، واضح ہے۔ لیاقت مرحوم خود بھی امریکہ سے امداد حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے مگر بغیر اپنے ملک کو گرائے اور بغیر جلد بازی سے کام لیے۔

ہونا برسرِ عام رونے لگتی ہے، وہ چوراہوں پر کھڑی ہو کر واویلا کرتی ہے کہ اگر ہمیں فلاں ملک سے امداد نہ ملی اور فلاں سے جلد از جلد سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔ وہ اپنے عوام کو تقریروں اور اخباری تحریروں کے ذریعے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ اگر فلاں کا دامن تھامنے سے تم نے ہمیں روکا تو پھر تم کہیں کے نہ رہو گے، بلکہ وہ خود بڑی طاقتوں کے سامنے جا کر اپنا سارا بھرم کھول دیتی ہیں کہ ہم تو اب ایک دن بھی آپ کے سایۂ شفقت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس پر جب وہ طاقتیں ان سے یہ دریافت کرتی ہیں کہ آپ اپنے عوام کو کسی صورت معاملہ پر کس طرح راضی کر سکیں گے تو وہ پہلے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہمارے عوام احمق، جاہل، بدھو اور غیر موثر طاقت ہیں۔ اصل چیز ہم ہی ہم ہیں، جو کچھ ہم کر دیں گے اس سے کوئی عمومی اختلاف نہیں ہوگا۔ چند آوازیں اٹھیں گی بھی تو از خود ٹھنڈی پڑ جائیں گی۔ لیکن دنیا کی بڑی بڑی کائیاں طاقتیں حالات کو اتنی سرسری نگاہ سے تو نہیں دیکھتیں، وہ ایسی قیادتوں سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جانتی ہیں کہ کسی ملک میں عوام کے اندر کیا کیا رجحانات پائے جاتے ہیں اور کس کا کتنا زور ہے۔ چنانچہ وہ پھر نام لے لے کر پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں کو کس طرح ساتھ لے سکو گے؟ اس پر بھولی بھالی قیادتیں اپنے مضبوط اقتدار کا حوالہ دے کر ان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ ان طاقتوں کو تو ہم کچل کے رکھ دیں گے۔ یہاں پہنچ کر ان کی قوتِ معاملہ گری آخری نقطہ پر آ گرتی ہے۔ پھر ان سے منوانے والے جو کچھ چاہتے ہیں، منواتے ہیں۔ میز کی لڑائی یکسر ہر جاتی ہے۔ جو لوگ اپنوں کو کچل کر غیروں سے معاہدے باندھتے ہیں وہ ملکی مفاد کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہی صورت معاہدۂ سویز میں پیش آئی۔ بیرونی امداد کا حصول صنعتی تعمیر، داخلی استحکام اور بین الاقوامی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے قطعی ناگزیر ٹھہرا۔ غیر جانب داری ناممکن محسوس ہوئی لہٰذا جانب داری کی ہر پست سے پست صورت کو جلد از جلد اختیار کرنا طے پایا۔ مطالبہ ہوا کہ انگریزوں سے معاہدہ کرنا ہوگا، یہ معاہدہ ہو گیا۔ تقاضا ہوا کہ اسرائیل سے تعلقات درست کرنے ہوں گے اور ان کے جہازوں کے لیے سویز کو کھول دینا ہوگا، تعلقات درست ہو گئے اور آج یہودیوں کے سامان سے بھرے ہوئے جہاز سویز کی موجوں پر سے گذر رہے ہیں۔ چاہا گیا کہ اخوان کا روڑا دوستانہ تعلقات کے راستے سے ہٹا دیا جائے، چنانچہ فوجی عدالتیں قائم ہو گئیں اور اخوان کے لیے پھانسیاں گاڑ دی گئیں۔ سطحی صاحب جس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں اس میں رہتے ہوئے وہ مشکل ہی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ناصری آمریت نے کتنا کم کمایا اور کتنا زیادہ کھو دیا ہے۔ ایک طرف بالکل کنارے بیٹھ کر انگریزوں نے اخوان سے انتقام لے لیا، دوسری طرف اخوان جیسی منظم طاقت سے خود

ناصر کو محروم کردیا جس کے تعاون سے وہ معاہدہ طے کرنے کے قابل ہوا تھا۔ تیسری طرف مصر کے عوام کے اعتماد کی زمین آمریت کے قدموں تلے سے نکلوادی، چوتھی طرف مسلمان ممالک کی وحدت کو سخت دھکا لگوادیا، پانچویں طرف احیائے اسلام کی ایک ایسی قابلِ قدر تحریک کو کمزور کر دیا جس کا اثر پورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا تھا اور جس کی دعوت مسلمانوں میں زندگی کا نیا ولولہ پیدا کرنے کا موثر ذریعہ تھی۔ اب ناصری آمریت کو اس درجہ کمزور کر لینے کے بعد آئندہ جو معاملات ہوں گے، آپ جیسا اخبار نویس کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر سکتا ہے کہ ان میں مصر کا پلڑہ اور کتنا ہلکا ہو جائے گا۔

سلہری صاحب بتائیں کہ جو لوگ ڈپلومیٹک میدان میں اپنی قوموں کے نادان دوست بن کر یہ بودی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہوں اور جو ڈھنڈورہ پیٹیں کہ لوگو سن لو ہم غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنے بل بوتے پر تعمیر و ترقی کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہم بغیر غیر ملکی امداد کے ایک دن جی نہیں سکتے اور پھر جو اپنے عوام کو مکھی اور مچھر کے برابر وقعت نہ دیں بلکہ ان کی جہالت اور ان کے جمہوریت کے نااہل ہونے کا اشتہار دیتے ہوں، اور بڑی طاقتوں کو تسلی دلاتے ہوں کہ ہمارے فیصلوں کے خلاف جو سر تابی کرے گا اسے ہم نابود کر کے رکھ دیں گے، اُن کے ہاتھوں کوئی معاہدہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں نفع کمانا تو الگ رہا، معاملہ برابر برابر کا طے ہو جائے؟ کیا ان کے بارے میں یہ فارمولا پیشِ نظر رکھنا کافی ہے کہ "آدم کا کوئی بیٹا کسی غیر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں ہو سکتا"؟ سمجھ دار حکمران اور لیڈر ہمیشہ اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی سمجھوتوں کے لیے جب بھی بات چیت ہو، بلکہ بات طے ہو جانے کے بعد بھی عوامی دائرے میں کوئی نہ کوئی عناصر ایسے موجود رہیں جو معاہدوں کے کمزور پہلوؤں پر اضطراب دکھائیں اور ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے رہیں تاکہ ان کے ہونے سے اپنی قوتِ معاملہ گری کو مضبوط تر رکھا جا سکے، نیز بعد میں بھی اپنی قومی خودداری میں کمی نہ ہونے دی جائے اور زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اب جن لوگوں کو نہ بات چیت کے دوران میں کسی کا اختلاف گوارا ہو، نہ بات طے کر لینے کے بعد تنقید کے لیے قوتِ برداشت رکھتے ہوں وہ جمال ناصر سے زیادہ شاندار کارنامے کیسے انجام دے لیں گے؟

بیرونی امداد انڈیا کے حکمرانوں نے بھی حاصل کی ہے لیکن اپنی آزادی، حاکمیت، بڑے بڑے مفاد، اور قومی خودداری پر بھی آنچ نہیں آنے دی۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے عوام کو اعتماد میں لے لیا، رائے عام کو زندہ رہ کر حالات پر اثر انداز ہونے کا موقع دیا، قوم کو معاملات کے بارے میں ہر اسٹیج پر آگاہ کیا، اختلافی نقطہ ہائے نظر رکھنے والوں کو تنقید کا اذن دیا۔ کیا امریکی امداد لینے کے لیے نہرو گورنمنٹ نے بھی کسی دوسرے ملک سے سمجھوتہ کرنا اپنے اوپر لازم ٹھہرایا؟

کیا کسی جماعت اور تنظیم کو خنجر برّاں ہاتھ میں لے کر ملیا میٹ کرنے کا کوئی کارنامہ سرانجام دیا؟ کیا اپنے دروازے دونوں
چوپٹ کھول دیئے کہ آؤ یہ چراگاہ تمہارے لیے بالکل کھلی ہے؟

پالیسی کا ایک راستہ یہ تھا، لیکن افسوس کہ ہمارے ممالک کی نیادتیں اور حکومتیں اس کے بجائے دوسرے راستے پر چل نکلی ہیں، یعنی چونکہ غیر جانبداری ممکن نہیں رہی اور تعمیر و استحکام کے لیے کسی طرف سے مدد کا حصول بالکل ناگزیر ہے، لہٰذا سب کچھ دے کر جلد سے جلد معاملہ طے کر لینا چاہیے۔ اس بودی پالیسی پر اخوان جیسے خیر خواہانِ ملک و ملت اگر کڑھے ہوں اور ان کا دردِ دل اظہارِ اختلاف پر مجبور ہو گیا ہو تو یہ کونسی ایسی بات تھی کہ آمریت تلوار لے کر پل پڑتی! بس یہ کافی تھا کہ وہ عوام کو معاہدہ کے بہترین ہونے کا یقین دلا دیتی اور اخوان کا اختلاف اجتماعی فیصلے کی رو کے آگے چار دن بھی نہ ٹھہر سکتا۔ اخوان کو رائے عام کے زور سے شکست دینے کے بجائے استبداد کا نشانہ بنانا اس امر کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ رائے عام آمریت کے حق میں نہیں تھی اور جمال ناصر اس بات سے بھی مایوس تھے کہ وہ مزید کوشش کے بعد دلیل کی قوت سے قوم کو ساتھ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی اگر اتنی کم سے کم حکمت و بصیرت انقلابی کونسل میں موجود ہوتی جتنی کسی ملک کا کارپرداز بننے کے لیے ضروری ہوتی ہے تو جمال ناصر ایک طرف مغربی طاقتوں سے تقاضا کرتے کہ میری قوم اس حد تک جانے پر تیار نہیں ہے، آپ کو موجودہ شرائط سے پیچھے ہٹنا پڑے گا، اور دوسری طرف خود قوم کو یہ تسلی دلا کر کہ ہو گا وہی کچھ جس پر تو راضی ہو گی، مزید افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھتے اور عوامی رجحانات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سازگاری پیدا کرتے۔ اس طرح آمریت کی قوتِ معاملہ گری میں بھی اضافہ ہوتا اور معاہدہ کے لیے داخلی فضا بھی بغیر خون خرابے کے تیار ہو جاتی۔ لیکن وہاں تو جلدی تھی اور ذہن قومی مفاد کے فیصلے کرنے کی اجارہ داری کے نشے میں تھا۔ جیسے جمال ناصر کو اپنی کسی ذاتی جاگیر کا کوئی معاملہ طے کرنا تھا اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ جی ہاں، وقت اس معنی میں ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا کہ آمریت کے ناپائیدار تخت کے پائے رائے عام کے عدم اطمینان کی وجہ سے متزلزل ہو رہے تھے۔ کیا معلوم کس لمحے کیا ہو جائے!

سلہری صاحب کی بصیرت کی روشنی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ اس معاہدہ سے مصر کا بین الاقوامی اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دوسروں کے جس درجے کے مطالبے مان کر یہ اثر و رسوخ حاصل کیا گیا ہے، اس کے ذریعے اب مصر اپنے اور اسلامی دنیا کے کتنے ایک پیچیدہ مسائل کو بین الاقوامی طاقتوں کے تعاون سے حل کرا لیتا ہے

یہودی ریاست کا مسئلہ ہے، ٹیونس، المغرب اور الجیریا کا مسئلہ ہے، پاکستان کے سامنے کشمیر اور نہری پانی کا مسئلہ ہے اب یہ سب مصر کے بین الاقوامی اثر و رسوخ سے حل ہو جائیں گے۔ پوزیشن ٹھیک وہی ہے جیسے غلام ہندوستان میں گورنر کے کسی دربار میں جب ایک ہندوستانی جمعدار یا کسی جاگیردار کو اپنی خدمات کے عوض کرسی مل جاتی تھی تو اس کے خاندان اور علاقے کے لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ اثر و رسوخ کبھی ان قومی و ملکی مسائل کے کام نہ آسکا جن سے عوام دوچار رہتے تھے، اس طرز کا اثر و رسوخ خود سامراج ہی کے کام آتا رہا۔ مصر نے ٹھیک اسی قسم کا بین الاقوامی اثر و رسوخ حاصل کیا ہے۔ وہ اپنا سر افتخار اس خیال سے بلند کر سکتا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی سرپرستی مجھے حاصل ہے، لیکن اس خیال کے غبارے سے اس دن ساری ہوا نکل جائے گی جس دن مصر کوئی ایسا مسئلہ چھیڑ دے جو ان سرپرستوں کے مفاد کے خلاف پڑنے والا ہو۔

دوسرے وجوہِ اختلاف سلہری صاحب نے تنہا معاہدۂ سویز کو ظاہری وجۂ اختلاف کی حیثیت سے پیش کیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے وجوہ کا ان کو سرے سے علم نہیں تھا، یا علم ہوتے ہوئے انہوں نے ان سے صرفِ نظر کر لیا ہے، بہرحال اس اداریے میں کوئی دوسری چیز مذکور نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ایک معمولی اخبار بین آدمی سے بھی مخفی نہیں کہ دو اور بڑے اختلافات کارفرما تھے۔ ان میں سے ایک اس مطالبے پر تھا کہ جو انقلاب اسلام کے نام پر اٹھایا گیا ہے اور جس میں ایک اسلامی تحریک نے بڑا پارٹ ادا کیا ہے اس سے عوام بجا طور پر یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ اسلامی نظامِ زندگی کی طرف ـــ کسی ہلکی سے ہلکی تدریج سے سہی ـــ عملی قدم اٹھنے چاہییں۔ لیکن آمریت نے نہ صرف یہ کہ اس مطالبے کو نظر انداز کیا ہے، الٹا عملی قدم اس کی مخالف سمت میں اٹھائے ہیں۔ اسلامی معاشرت کی بچی کھچی قدروں کو تلپٹ کرنے کے لیے آرٹ کے مہذب نام پر ناچ گانے کی مجلسیں منعقد کرنے اور بے حیائی و بے پردگی کی وبا کو پھیلانے، خصوصاً غیر ملکی لوگوں کے لیے "مرشدات" (گائڈ کا کام کرنے والی بے باک لڑکیاں) فراہم کرنے کا جو نیا طوفان اٹھایا گیا اس کی طرف اخوان نے ناصر کو بار بار متوجہ کیا کہ یہ ان وعدوں سے انحراف ہے جن کے ساتھ انقلاب اٹھایا گیا تھا۔ اس پر مزاجِ یار برہم ہوا اور ہوتا چلا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ سلہری صاحب اس معاملے میں اخوان کو مذہبی تنگ نظری کا الزام دے کر آرٹ کے ان مظاہروں کو ضروری چیز قرار دیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس چیز کو اسلام اور اسلامی نظام ـــ ہمارے نقطۂ نظر سے نہ سہی، خود آپ حضرات کے نقطۂ نظر سے ـــ کہا جاتا ہو، اس کی طرف ناصری آمریت کا کوئی ایک قدم

اس پورے عرصہ میں اٹھا ہوا دکھا دیجیے کہ یہ "اسلامی کارنامہ" جب موجود تھا تو اخوان نے جلد بازی اور انتہا پسندی سے کیوں کام لیا؟

دوسرا بڑا اختلاف جمہوریت کی بحالی کے مطالبے پر واقع ہوا ہے۔ مصری پبلک اور اخوان نے ہنگامی حالات اور فوجی آمریت کو ایک مختصر ترین عرصے کے لیے اس اعلان پر قبول کیا تھا کہ فوج صرف خیانت "(CORRUPTION) کا قلع قمع کرنے کے لیے اقتدار کے ایوان میں رُک گئی ہے، ورنہ سیاسی کارفرمائی کا بکھیڑا فوج کے بس کا روگ نہیں، ہم لوگ تو سپاہی ہیں، جلد سے جلد اپنی بیرکوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ آمریت کے منصوبے لے کر اٹھتے ہیں ان کا راستہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ وہ ہنگامی حالات کے اعلان کے سائے میں کسی نہ کسی طرح تخت بچھا لیتے ہیں، پھر اس کے پائے مضبوط کرتے ہیں، اور پھر انا ولا غیری کا نعرہ لگاتے ہیں۔ فوجی حکومت نے پارٹیوں کو ختم کر کے جونہی ہنگامی حالات کی رسّی دراز کرنا شروع کی، عوام میں اضطراب پیدا ہوا۔ اسی اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے اخوان نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم اخوان کے مرشد عام شیخ حسن الہضیبی کے اُس مکتوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو موصوف نے ناصر کو لکھا تھا اور خود پاکستان کے پریس میں شائع ہو چکا ہے۔

اس خط میں شیخ موصوف نے ناصر سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جمہوریت اور دستوری زندگی کو از سرِ نو قائم کر دیا جائے اس کے ساتھ دوسری یہ بات پیش کی ہے کہ جو ہنگامی قوانین، احکام اور فیصلے نافذ کیے گئے ہیں ان کو واپس لیا جائے قیدیوں اور نظر بندوں کی بھاری تعداد کو رہا کر دیا جائے۔ نیز پریس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ لیکن ایک آمر کی نگاہ میں سب سے زیادہ شر انگیز مطالبہ یہی ہو سکتا ہے چنانچہ ناصر ایسے مطالبے پر اپنے غیظ و غضب کو کس طرح پی جاتے انہوں نے جمہوریت کا مطالبہ کرنے والوں کو اس کا جواب وہ دیا جس کی داستانوں سے آج اخبارات کے صفحے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن سلہری صاحب نے ان وجوہِ اختلاف کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ وہ صرف معاہدۂ سویز کے اختلاف کا ذکر فرما کر رہ گئے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ اسے اخوان نے پردۂ فریب (SMOKE SCREEN) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس "پردۂ فریب" کے پیچھے کونسی گھناؤنی شرارت چھپی ہوئی تھی؟ سلہری صاحب پردہ چاک کر کے اسے سامنے لے آئے ہیں۔ وہ ہے برسرِ اقتدار آنے کی تمنا! ذرا ملاحظہ فرمائیے ان حضرات کا

طرزِ فکر، کہ یہ خود چاہے رائے عام کا قتلِ عام کرکے آمرِ مطلق بن بیٹھیں اور پھر اقتدار کو ہمیشہ کے لیے اپنی جاگیر بنالیں یہ ان کا مانا ہوا اہلِ استحقاق ہے، لیکن ان سے اختلاف کرنے والے لوگ کسی بہتر سے بہتر نصب العین کے لیے سو فیصدی جمہوری طریقوں سے بھی اگر ملکی معاملات میں دخیل ہونا چاہیں تو اُن لوگوں کے حق میں یہ ایک ایسی گھناؤنی ہوس اور شرارت ہوجاتی ہے کہ جسے فریب کے پردوں میں لپیٹے بغیر کہیں رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ مگر بات اتنی ہی نہیں سلہری صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ھضیبی صاحب کے اندر تنہا خود سب کچھ ہونے (TO BE ALL IN ALL) کی حرص کارفرما تھی اور وہ اصل واحد طاقت (THE REAL AND ONLY POWER) بننا چاہتے تھے۔

قطع نظر اس سوال سے کہ جس منطق کے رو سے آپ کرنل جمال ناصر کے لیے تنہا سب کچھ بننے کا جواز نکال کے دیتے ہیں وہ ھضیبی کو اس کا حق کیوں نہیں دیتی، ہم دوسری طرف جانا چاہتے ہیں۔ ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ ایک منظم طاقت جو ایک انقلاب میں میجر پارٹ ادا کرتی ہے، کیا دورانِ انقلاب اور اس کے فوراً بعد اس کا کوئی موقع نہیں رکھتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اہم مناصب پر اپنے آدمی ڈالتی اور پھر آہستہ آہستہ سب کچھ (ALL IN ALL) بننے کے لیے پاؤں پھیلاتی چلی جاتی ؟ ہوسِ اقتدار کی ہواجن ذہنوں میں بھری ہوتی ہے۔ ان کا نقشۂ کار یہ نہیں ہوتا کہ پہلے وہ ایوانِ اقتدار سارے کا سارا دوسروں کے حوالے کردیں اور پھر پردہ ہائے فریب میں اپنی ہوسِ اقتدار کو چھپائے کبھی اس دروازے سے جھانکیں، کبھی اس کھڑکی سے دیکھیں کہ کدھر سے راستہ ملتا ہے اور دوسروں کو آمر بنانے کے بعد پھر ان سے اختلاف کی لڑائی لڑیں۔ الٹا اخوان کی پوزیشن اس معاملے میں اتنی زیادہ "منفیانہ" ہے کہ اس وجہ سے طاقت کی باگ ڈور بالکل غلط ہاتھوں میں چلی گئی۔

اخوان کا یہ جُرم متعین کرلینے کے بعد کہ وہ برسرِ اقتدار آنا چاہتے اور سب کچھ تنہا وہ خود بننا چاہتے تھے، اب سلہری صاحب ان کی طرف سے مسلح بغاوت اور ملک کو تباہی اور انتشار کے حوالے کردینے کے ہولناک خطرات ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان ہولناک خطرات کو مصری آمریت کی دی ہوئی یہ خبر خود بخود ٹھوس بنادیتی ہے کہ اخوان کے قبضے سے اسلحہ کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں۔ گویا اب اخوان کے خلاف فردِ قراردادِ جُرم مکمل ہوگئی جس طاقت کے خلاف یہ فردِ قراردادِ جرم عائد ہوجائے اس کے ساتھ آخر بجز اس کے اور کیا سلوک روا رکھا جاسکتا ہے جو ناصری آمریت نے روا رکھا ہے۔ یہ ہے سلہری صاحب کی بحث کا خلاصہ! ہم صرف اتنا دریافت کرتے ہیں کہ اگر یہ فرد

قرارداد جرم سو فیصدی برحق تھی تو اس میں کیا امر مانع ہوا کہ اخوان کا معاملہ سول عدلیہ کے حوالے کرنے کے بجائے خود حکمرانوں نے قاضی بن کر فوجی عدالت میں طلب کیا ؟ کیا دلیل جواز ہے اس بات کے لیے کہ سرسری سماعت کر کے سنگین سزائیں سنا دی گئیں اور نافذ کر دی گئیں ؟ لیکن ناصری آمریت سلہری صاحب کی نگاہوں میں اتنی معصوم ہے کہ وہ اس کے کسی اقدام سے بھی تعرض نہیں فرماتے ۔

ایک اہم سوال | اس بحث کو خاتمے تک لاتے لاتے ہمارے فاضل صحافی دوست نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب فوجی حکومت اخوان کے زیر ہدایت کام کرنے (TO BE GUIDED BY BROTHERHOOD) پر تیار تھی تو کونسا مانع تھا کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہ کر سکے ؟ سلہری صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کا جواب دے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح کے انتہا پسند اور زعم صالحیت رکھنے والے (SELF RIGHTIOUS) لوگوں کی یہ ایک مستقل کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اعتدال اختیار کرنے، حالات کے نقشے میں اپنی جگہ پیدا کرنے اور دوسروں سے سازگاری کرنے کی خوبی سے محروم ہوتے ہیں ۔

ایک تو اس معاملے میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ کن دلائل و شواہد سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ فوجی حکومت اخوان کو پیر و مرشد بنا کر کام کرنے پر آمادہ تھی لیکن جزوی سے جزوی معاملات میں فوجی حکومت نے اخوان کے نقطۂ نظر کے مطابق کوئی کام کیا ؟ اور تو اور جو لوگ یہ تک نہ مان سکے کہ بغیر اسلام کا نام لیے، اور بغیر اسلامی حکومت قائم ہونے کا اعلان کیے (کیونکہ اس سے بین الاقوامی طاقتوں کے بگڑ جانے کا خطرہ تھا) کچھ نہ کچھ اصلاحات و تغیرات اسلام کے منشا کے مطابق بھی کر دئے جائیں ، اور جو لوگ کہ جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں کسی ادنے درجے میں کوئی تدریجی قدم تک اٹھانے پر تیار نہ ہوئے ان کے بارے میں سلہری صاحب یہ دلچسپ انکشاف فرماتے ہیں کہ وہ اخوان کی زیر ہدایت کام کرنے کو بخوشی آمادہ تھے ۔ اخوان کا اپنا قصور ہے کہ ایسے لوگوں کا تعاون انہوں نے خود ہاتھ سے کھو دیا ۔ دوسرے ہم اس پہلو سے بھی معلومات کے محتاج ہیں کہ اب تک جو حالات سامنے آچکے ہیں ان کے اندر اخوان کے کن کن اقدامات یا مطالبات سے انتہا پسندی اور زعم صالحیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے ؟

علاوہ بریں ہم اسی سوال کو اگر الٹ کر دوسرے فریق پر وارد کریں کہ وہ اخوان جو جہاد فلسطین کے زمانے سے فوجی عناصر کے ساتھ دوستی اور رفاقت رکھتے تھے ، جنہوں نے جانوں کی بازی کھیل کر انقلاب کے لیے راستہ صاف کیا اور جو خود

انقلاب کے سپاہی بن کر میدان میں کام کرتے رہے، آخر کون سے اسباب کے تحت فوجی آمریت نے ایسے اچھے ساتھیوں کا تعاون کھو دیا اور کیوں نہ وہ ان کے ساتھ سازگاری پیدا کر سکی؟ ایک اتنی عظیم طاقت جس سے آئندہ مصر کی تعمیر و ترقی میں بہت بڑے کام لیے جا سکتے تھے۔ کونسی رکاوٹ پیدا ہوئی کہ فوجی اکابران کو باقی رکھ کر ان سے مزید کام لینے کے بجائے اُن سے بگڑ بیٹھے اور ان کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تُل گئے۔ معلوم نہیں سلہری صاحب مصری آمریت کی طرف سے کیا جواب اس کا دیں، ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ڈکٹیٹر شپ جب بھی ابھری ہے ڈکٹیٹر شپ میں دوسروں سے سازگاری (COMPROMISE) پیدا کرنے کے لیے کبھی بھی لچک نہیں پائی گئی۔ دیکھ لیجیے اٹھا کے فراعنۂ نمارۂ قدیم کی تاریخ۔ پھر ملاحظہ فرمالیجیے ہٹلر اور مسولینی کے کردار کو، اور پھر جائزہ لے لیجیے روس کے کمیونسٹ انقلابیوں کے کارناموں کا! پھر خصوصیت سے مسلمانوں کے اندر سے "تیرہ سو سال پرانے دین" اور اس دین کو ماننے والے "ملاؤں" کے خلاف "جوشِ جہاد" لے کر اگر کوئی آمر اٹھا ہو تو وہ مصطفےٰ کمال سے ورے ورے کہیں تھم نہیں سکتا۔ ترکیہ کے کمال کو مصر کے جمال نے نیچے چھوڑ دیا ہے۔

جمال ناصر اور اس کی انقلابی کونسل میں اتنی لچک موجود نہیں تھی کہ وہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اسلامی نصب العین کی طرف کوئی ایک دو چار قدم اٹھا کر رائے عام کو راضی کر سکتی، وہ جمہوریت کی قدروں کے بجھے ہوئے دیوں میں سے کسی ایک آدھ ہی کو اخوان کے مطالبے پر ٹمٹمانے کا موقع دے سکتی، اور معاہدۂ سویز کو کچھ اور بہتر بنانے اور عوام کو اس کے لیے اعتماد میں لینے کی خاطر تھوڑا سا التوا ہی پیدا کر دیتی! چنانچہ سلہری صاحب کے بقول جو جنتا راج بالکل اخوان کی ہدایت اور رہنمائی میں کام کرنے پر تیار تھا اُس نے ایک ہی جست ایسی لگائی کہ پھر وہ اخوان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یا وہ انتہا تھی، یا یہ آخری حد! ایسے لوگوں کے ساتھ آخر کون سازگاری پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

اس موقع پر بسبیل تذکرہ خود پاکستان کے فرماں رواؤں کے بارے میں بھی سلہری صاحب سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ گذشتہ سات برس میں تعاون کی بار بار کی پیشکشوں اور کوششوں کے باوجود کبھی کوئی ایک مثال بھی ایسی سامنے آئی ہے کہ تحریکِ اسلامی، جماعتِ اسلامی، ملک کے باشعور دینی عناصر اور اسلامی نظام چاہنے والے عوام کا اعتماد اور عملی تعاون حاصل کرنے کی کوشش ان حضرات نے کی ہو؟ کسی معاملے میں انہوں نے دینی عناصر کے کسی بھی کام کو سراہا ہو؟ کسی ملکی مسئلے میں ان سے مشورہ لینے کی ضرورت سمجھی ہو؟ کبھی ان سے اپنے آپ کو قریب تر لانے کے لیے اپنے فیصلوں اور رجحانات میں

کوئی ڈھیل پیدا کی ہو؟ کبھی ان کو کوئی اہمیت دی ہو؟ ـــ کچھ بھی نہیں! شروع سے آج تک برابر حکمراں طبقے نے دینی عناصر کے سامنے اپنے آپ کو ایک آہنی دیوار میں محفوظ کر کے رکھا ہے۔ اب کل کوئی اخبار نویس ان دینی عناصر کی فردِ قراردادِ جرم مرتب کرتے ہوئے اگر ان کو انتہا پسند، حالات سے سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے، سب کچھ تنہا خود ہی بننے کے حریص اور زعمِ صالحیت میں مبتلا قرار دے کر ان کا یہ قصور دنیا پر ثابت کرتا نظر آئے کہ انہوں نے حکمراں طبقے سے کبھی تعاون کر کے نہیں دیا، تو کون اس اخبار نویس کا قلم پکڑ سکے گا۔

اصل واقعہ بالکل نمایاں شکل میں یوں ہے کہ اخوان جیسی محبِ دین و وطن طاقت کے تعاون کو مصری آمریت نے خود ہی اپنی انتہا پسندی اور تنگ ظرفی کی وجہ سے ٹھکرا دیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہزار ہا جیتے جاگتے اور دیکھتے سنتے انسانوں کے سامنے اس واقعہ کی بالکل الٹی تصویر کھینچ کر لٹکا دی جائے۔

سلفِ صالحین کی طرف اشارہ اس موقع پر سلہری صاحب نے مسلمانوں کی گذشتہ ملی تاریخ پر بھی ایک تنقیدی جملہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس طرح کے (سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے) گروہ پہلے بھی بڑے خلوص کے ساتھ صالحیت کے تصورات کا دامن تھامے حکومتِ وقت کے خلاف اٹھتے رہے ہیں، لیکن ان کی مساعی کبھی بارآور نہ ہوسکیں۔ آپ کچھ سمجھے یہ تبصرہ کن لوگوں پر ہو رہا ہے؟ یہ ذکر ہے ہماری تاریخ کی ان لامثال ہستیوں کا جن سے ہمارا ماضی جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ یہ ان عناصر کی شان بیان ہو رہی ہے جنہوں نے اگر اپنی قربانیوں سے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی تو ہمارے شاہانِ جبار کے ہاتھوں حالات کا فساد اس حد تک جا پہنچتا کہ اسلام کے اساسی اصول اور اس کی درجۂ اول کی تہذیبی و اخلاقی قدریں ملیامیٹ ہو چکی ہوتیں۔ ہاں یہ تذکرہ ہے شہدائے کربلا کا۔ یہ بیان ہے امام احمدؒ ابن حنبل اور امام مالکؒ کا، یہ اشارہ ہے امام ابوحنیفہؒ کی طرف، یہ انگلی اٹھائی جا رہی ہے مجدد الف ثانیؒ کی ہستی کی طرف، یہ موقف بیان ہو رہا ہے سید احمدؒ شہید اور شاہ اسمٰعیلؒ شہید کا! یہ سب حکومتِ وقت کی برہمی کے علی الرغم دعوتِ حق کے چراغ اپنے خون کے روغن سے جلانے کے مجرم ہیں۔ یہ زعمِ صالحیت سے سرشار ہو کر شاہانِ وقت کی پالیسی سے سازگاری پیدا نہ کرسکنے کے قصوروار ہیں۔ حالانکہ اصل صورتِ واقعہ بالکل برعکس رہی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بادشاہت کا تخت بچھ گیا تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے اکثر کا حال یہ رہا ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو کبھی برداشت نہیں کرسکے۔ انہوں نے دوسروں کے لیے کبھی اتنی رواداری نہیں دکھائی کہ دربار اور محل کے نظریات کے خلاف دوسرے کو اپنی بات کہنے اور سنانے کا حق حاصل رہے۔ پھر اگر کسی "سازگاری پیدا نہ کرسکنے والے" نے جرأت مندی کے ساتھ کوئی

کلمۂ حق کہہ دیا ہے تو دلیل سے اس کا توڑ کرنے کے بجائے "تاج" نے ہمیشہ تلوار سے کام لیا ہے۔ آج تک تمام مسلمان اہلِ علم و فکر پوزیشن کو اسی طرح سمجھتے آئے ہیں اور ملت کی ہمدردیاں پوری کی پوری اعلائے کلمۂ حق کے قصورداروں کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ شاید پہلا موقع ہے کہ ہمارے ایک صاحبِ قلم نے اس پوزیشن کو اُلٹ دیا ہے اور ان قصورواروں کے خلاف "تاج" کے مقدمے کی حمایت کی ہے۔

مگر سلہری صاحب اگر ذرا اور اوپر چلے جائیں اور انبیاء کی تاریخ پر بھی اسی طرح نگاہِ تنقید ڈالیں تو وہ بتائیں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کے بارے میں کیا رائے دیتے ہیں؟ کون ان میں سے قائم شدہ نظام (ESTABLISHED ORDER) کے ساتھ سازگاری کرسکا؟ کیا نعوذ باللہ یہ سب انتہا پسند، زعمِ صالحیت میں مبتلا اور سب کچھ خود ہی بننے کے حریص لوگ تھے اور اسی قصور کی سزا انہوں نے بھگتی؟ آدمی جب ایک غلط نقطۂ نظر کو زادِ راہ بنا کر تحقیق و تبصرہ کے سفر پر چل کھڑا ہوتا ہے تو پھر وہ ایسے ایسے کنوئیں جھانکتا ہے کہ عقل کا سر چکرا جاتا ہے۔

اوپر کی اس ساری بحث سے سلہری صاحب پاکستان کے لیے درسِ عبرت اخذ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے پاکستان میں چوکنا ہو جانا ضروری ہے، کیونکہ ہم اس طرح کی گمراہ شدہ تحریکات کے خطرے سے آزاد نہیں ہیں لیکن عبرت کا یہ سبق پڑھاتے ہوئے وہ بہت سی اہم اور قیمتی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان باتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔

برطانوی رواداری کی مثال | ہمارے فاضل صحافی دوست نے بڑے حسرت بھرے انداز میں اپیل کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ میٹھا پھل صرف ان سوسائٹیوں نے دیا ہے جن میں رواداری کی فضا قائم ہے۔ مثال کے طور پر وہ برطانوی معاشرے کو سامنے لاتے ہیں۔ جہاں مجرد خیالات کے عمل در ردِّ عمل کے ذریعے ادارات میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مثال کو اداریے میں پیش کرتے ہوئے سلہری صاحب نے یہ خیال بھی فرمالیا کہ مصر میں ناصر کی آمریت، یا خود پاکستان میں حکمران طبقے کی پالیسی کیا اس معیار پر کسی ادنیٰ درجے میں بھی پوری اترتی ہے؟ رواداری کی فضا بنانے میں بڑا حصہ حکمران طاقت کا ہوتا ہے جو پے درپے ایسی روایات اور ایسے نظائر قائم کرتی ہے کہ جن سے تربیت پا کر سیاسی جماعتیں اور عوام باہم دگر زیادہ سے زیادہ روادار ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بدنصیب مسلم ممالک میں جب خود حکمران طاقتیں ہی دستوری قدروں، جمہوری روایات اور رواداری کے تقاضوں کا دن رات گلا

گھونٹ رہی ہوں تو جماعتوں اور شہریوں کے سامنے برطانیہ کی مثال لا لا کے رکھنے سے فائدہ ؟ وہاں آمریت قائم ہے اور یہاں آزادی کے دستور سے محروم ایک قوم ایسے اکابر کے پنجۂ گیرا میں ہے جو جمہوریت کے نام کی نقاب اوڑھے ہوئے مستبدانہ قوانین اور ہنگامی اختیارات کے دشنہ ہائے پنہاں آستین میں لیے شہری آزادیوں پر برابر عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایسے میں جماعتیں اور افراد زیادہ سے زیادہ جس ناروا داری کے مجرم ہیں وہ بس یہ ہے کہ اپنے حاکموں کی شانِ رواداری کے خلاف وہ فریاد کرتے رہتے ہیں۔ سلہری صاحب شاید یہ چاہتے ہوں کہ ان سے فریاد کا یہ حق بھی لے لیا جائے۔ کیا اس کے بعد برطانیہ جیسی رواداری کی فضا بن جائے گی ؟

اضطراباتِ پنجاب کا حوالہ | دینی عناصر کی عدم رواداری کے ثبوت میں اس موقع پر سلہری صاحب اضطراباتِ پنجاب کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس واقعہ میں کئی پہلو ایسے ہیں جن کو خود دینی عناصر میں سے بھی کوئی صحیح قرار نہ دے گا۔ لیکن اس واقعہ کے اندر سے دینی عناصر کی عدم رواداری کا ثبوت نکال کے سامنے لاتے ہوئے ایک منصف مزاج آدمی کو دوسرے فریق کا معاملہ بھی زیرِ تبصرہ لانا چاہیے تھا۔ آپ یہ فرمائیے کہ اگر برطانیہ میں کوئی ایسا کرب انگیز معاشرتی و سیاسی مسئلہ موجود ہوتا جس کی وجہ سے باشندگانِ ملک مسلسل پچاس برس سے تڑپ رہے ہوں تو کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کی حکمراں طاقت اس سے آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ؟ اس مسئلے پر خیالات کے میدان میں اگر شور مچتا تو وہ کانوں میں روئی ٹھونس لیتی ؟ اگر اس کے بارے میں اس کے سامنے دلائل لائے جاتے تو وہ ان کا جواب دلائل سے دینے میں پہلو تہی کرتی ؟ اگر اس پر جلسوں اور قراردادوں کا طوفان اٹھتا تو وہ اسے دفعہ ۱۴۴ اور سیفٹی ایکٹ کے زور سے روکتی ؟ اگر اس پر مظاہرے ہوتے تو لاٹھیوں اور گولیوں سے جواب دیتی ؟ پھر جب اس کی اپنی کوتاہی سے معاملات اور آگے بڑھ جاتے تو وہ مارشل لا لگا کر لوگوں کو فوجی عدالتوں سے سنگین سزائیں دلوا کر مطمئن ہو جاتی کہ اس نے رواداری کا حق ادا کر دیا ؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ سلہری صاحب ایک فریق کو تمام تر برسرِ حق اور دوسرے کو سرتاپا قصوروار ٹھہرانے کی اس پوزیشن میں رواداری کے کس اصول کے تحت اپنے آپ کو نصب کرتے ہیں۔ انہوں نے اگر ہر دو فریق کو ایک جج کی سی غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھا ہوتا تو ان کا اداریہ ہر پڑھنے والے کو متاثر کرسکتا۔ لیکن وہ تو شروع سے آخر تک جانبدار وکیل بن کر بولے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے قیمتی خیالات کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔

پاکستان کا اسلامی ریاست ہونا اب فاضل مدیر اس مرکزی موضوع کو چھیڑتے ہیں جس کے گرد یہ ساری کی ساری بحثیں گھوم رہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اسلامی ریاست کے تصور اور ڈھانچے پر بڑی بحث و تمحیص پائی جاتی ہے وہ مانتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اسی چیز کے لیے زندگی اور موت کی بازی کھیلی ہے۔ اور اس لیے پاکستان اسلامی ریاست کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتا۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بالفعل صحیح معنوں میں ایک مکمل اسلامی ریاست ہے۔ دلیل؟ یہ کہ مسلمانوں اور تنہا مسلمانوں نے اسے قائم کیا ہے۔ درحقیقت کہنا یہ چاہیے تھا کہ چونکہ اسے مسلمانوں نے قائم کیا ہے لہٰذا چاہیے یہی کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہو۔ لیکن سلہری صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک ٹھیک ٹھاک اسلامی ریاست ہے، کیونکہ اسے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ مثلاً ایک کاروباری ادارے کو اگر مسلمان قائم کریں تو چاہیے یہی کہ کاروبار اسلامی خطوط پر چلے۔ لیکن اگر اس کے بجائے یہ کہا جائے کہ چونکہ ایک ادارے کو مسلمان چلا رہے ہیں، لہٰذا چاہیے وہ شراب ہی کا کاروبار کیوں نہ کر رہا ہو اور جھوٹ اور فریب کے ہتھکنڈوں سے کیوں نہ نفع کمایا جا رہا ہو، وہ بالفعل اسلامی ہے۔ تو یہ بات بالکل مضحکہ انگیز سی ہوگی۔ مسلمانوں کے ہاتھوں بادشاہت کی ذلیل ترین صورتیں قائم ہوئی ہیں۔ آج وہ آمریت چلا رہے ہیں، کہیں وہ مادہ پرستانہ جمہوری نظاموں کو لے کے چل سکتے ہیں۔ روسی ترکستان میں کمیونسٹ حکومت چل رہی ہے اور اس کے بے شمار پرزے خود مسلمان ہیں، کیا ان ساری صورتوں میں نظام کو ہم اسلامی سمجھیں گے اور اس کے تمام وظائف اور اقدامات کو مطابقِ اسلام قرار دیں گے؟ پہلے فارمولا متعین کیجیے۔ وہ یا تو یوں ہوگا کہ مسلمان جو کچھ کریں اسلامی ہے، یا یوں ہوگا کہ جو کچھ اسلام کے مطابق کیا جائے وہ اسلامی ہوگا۔ افسوس ہے کہ سلہری صاحب نے پہلا فارمولا اختیار کیا ہے جو صراحتہً باطل ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے اس وسیع تصور کے دائرے میں کوئی بحث و اختلاف نہیں۔ بحث و اختلاف نسبتاً چھوٹے دائرے میں ہے۔ یعنی نظریاتی، ذہنی اور دستوری دائرے میں اختلافی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں آکر معاملہ اپنی اپنی رائے کا ہو جاتا ہے۔ اسلام میں کوئی کلیسائی ادارہ (CHURCH) نہیں اور نہ کسی مذہبی طبقے کی کوئی حیثیت ہے کہ وہ اپنی رائے عام لوگوں پر ٹھونس دے!

کسی مودودی کا حقِ رائے دہی اداریہ کے اس حصے میں جیسے ایک چھلا چھپٹ رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشکل یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مودودی یہاں اور کوئی احتشام الحق وہاں سے ادعا کرتا ہے کہ اُن کے رائے کوئی ایسی ذاتی سند رکھتی ہے کہ لوگوں کو چپ چاپ اس کے آگے جھک جانا چاہیے۔ مولانا احتشام الحق کی طرف سے تو ہمیں بولنے کا اتنا زیادہ حق حاصل نہیں البتہ

مودودی صاحب کے بارے میں اتنا ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا مودودی نے گزشتہ ۱۲، ۱۵ برس میں کوئی پیری مریدی کا سلسلہ تو نہیں چلایا ہے کہ لوگوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ انھوں نے کرامات اور شعبدے دکھا کر تو دنیا کو مسخر نہیں کیا! انھوں نے سیفٹی ایکٹ کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر تو دنیا کو مجبور نہیں کیا کہ مجھے اتھارٹی مانو! انھوں نے دوسروں کی زبان بندی اور قلم بندی کے احکام تو نہیں جاری کرائے! انھوں نے اختلاف کرنے والوں کو پھانسی اور قید بامشقت کی سزائیں تو کبھی نہیں دیں! مولانا مودودی نے ۱۹۳۲ء سے لے کر آج تک دلیل[1] سے اپنی بات پیش کی ہے، انھوں نے نشر و اشاعت کے ذرائع سے کام لیا ہے، علمی مجالس میں خطاب کئے ہیں، جلسہ ہائے عام میں تقریریں کی ہیں، وکلاء کی انجمنوں میں بیٹھ کر مذاکرات کئے ہیں، لوگوں کے سوالات اور اعتراضات کے جواب دئے ہیں، گالیاں کھائی ہیں الزامات کے حملے سہے ہیں اور رائے عام کے میدان کا ایک ایک انچ حصہ دلیل کے معرکے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بہت سے مدارسِ فکر موجود ہیں کہ جن کو باہم دگر اختلاف ہے تو کیوں کسی ایک کی بات مانی جائے جب کہ اس کے لیے کوئی اسلامی سند موجود نہ ہو۔ اس کے جواب میں قابلِ عمل صورت وہی ہے جیسے آپ خود اس اداریے میں پیش فرما رہے ہیں جس کے پاس کوئی نظریہ و فکر ہو، وہ اسے لے کر رائے عام کے میدان میں آئے، اپنے دلائل پیش کرے، لوگوں کو مطمئن کرے اور پھر جس چیز پر اکثریت مطمئن ہو کہ اسلامی ریاست کا یہی تصور وہ پسند کرتی ہے، وہ جمہوری اصول پر نافذ ہو جائے یہی راستہ مولانا مودودی نے اختیار کیا ہے۔ اس پر وجہ تکدر کیا ہے! آخر آپ بتائیے تو سہی تو کس مودودی اور کس احتشام الحق نے آپ سے یہ حق سلب کر لیا ہے کہ آپ اپنے تصورات کو نہ لائیں اور ان کے لیے دلائل دے کر عوام کو ساتھ نہ لیں۔ اگر کسی کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر کہیں گے کہ اسے ضرور پھانسی دے دی جائے۔

لیکن اندازِ گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلہری صاحب چاہتے یہ ہیں کہ کسی مودودی اور کسی احتشام الحق کو سرے سے اپنے نظریہ و تصور کو پیش ہی کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے، اور اگر یہ حق ہو بھی تو ان کو اپنی بات ایسے قوی دلائل اور ایسے موثر انداز سے ہرگز نہ پیش کرنی چاہیے کہ مسابقتِ استدلال میں وہ بازی جیت بھی جائیں۔ وہ اگر بازی جیت جائیں تو ان پر یہ الزام

---

[1] اس کی ایک مثال "قادیانی مسئلہ" نامی پمفلٹ ہے۔ مولانا نے اس میں مسئلہ کے مختلف پہلو دلائل کے ساتھ پیش کر کے یہ چاہا تھا کہ اگر ان کے خلاف کسی کے پاس دلائل ہوں تو وہ ضرور پیش کئے جائیں۔ لیکن دلائل کا جواب دلائل سے نہیں۔ کورٹ مارشل سے دیا گیا۔

دکھا جائے کہ تم حکمانہ اتھارٹی کے ساتھ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہو۔

سلہری صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نظریات وتصورات کے انتخاب کا حق عوام کو ہونا چاہیئے۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے عوام کے اسی حق کو سامنے رکھ کر اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے تصورات ہمیشہ عوام تک پہنچائے ہیں اور جو مطالبہ بھی پیدا ہوا ہے عوام ہی کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ پھر اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ پارلیمینٹری ادارات عوام کے اجتماعی تصورِ اسلام کے اظہار کا مناسب ترین ذریعہ ہیں۔ اور اسی ذریعہ سے کسی چیز کو نافذ ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب یا جماعتِ اسلامی نے کوئی مسلح بغاوت کرا کے یا کسی با اختیار فرد کے سر پر پستول رکھ کر کوئی بات آج تک منوائی ہے اور کبھی پارلیمینٹری راستے سے ہٹ کر اپنے دستوری تصورات کو ملک پر مسلّط کرنے کی کوشش کی ہے؟ اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے انھی پارلیمینٹری ادارت کے ذریعے ہوا ہے۔ قراردادِ مقاصد اسی ذریعے سے پاس ہوئی تھی، رہنما اصول اسی طریقے سے طے پائے تھے اور مسودہ دستور نے ایک خاص شکل اسی طریقے سے اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے اس دوران میں قدم قدم پر رائے عام کو دبانے اور اس سے انحراف کرنے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے کی تدبیریں لڑائی جاتی ہیں۔ آخر میں جب ان تدبیروں کے علی الرغم کسی نہ کسی حد تک اسلامی خطوط پر دستور سازی کا کام تکمیل کو آ پہنچا تو سرے سے دستور ساز کا وجود ہی ختم کرنے کی کوشش کر ڈالی گئی۔

ایک ایک حرف جو سلہری صاحب نے لکھا ہے کہ یہ ہونا چاہیے اور یہ نہ ہونا چاہیے، وہ ٹھیک اسی موقف کی تصویر پیش کرتا ہے جسے جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ پھر اعتراض کس چیز پر ہو رہا ہے اور درسِ عبرت کس معاملے میں دیا جا رہا ہے؟

ہاں! آخر میں یہ بھی پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ جن عوام کو سلہری صاحب بار بار فائنل اتھارٹی اور فیصلہ کن طاقت قرار دے رہے ہیں، ان کی اتھارٹی اور ان کے اختیار کی کیا گت گذشتہ سات برس میں بنتی رہی ہے اور آج کیا بن رہی ہے۔ عوام کو کب کسی نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو، کس طرح سوچتے ہو، کیا چاہتے ہو؟ مسلم لیگ کا تعلق پاکستان بنتے ہی عوام سے کٹ چکا۔ حکمران طبقے کا حال یہ ہے کہ وہ پہروں میں چلتا ہے اور ریڈیو پر سے وعظ کہہ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارے اکابر کسی مسئلے کو لے کر میدان میں آئیں، لوگوں کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر بات کریں، اپنے دلائل دیں اور ان کے دلائل سنیں، معلوم کریں کہ ان کے مسائل اور مطالبات کیا ہیں، وہ کیسا نظام زندگی چاہتے ہیں اور وہ کن تبدیلیوں کے لیے بےچین ہیں؟

اتنا ہی نہیں کہ عوام سے قریب ہو کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی نہیں جاتیں، الٹا یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی مسئلے پر جب مطالبات لے کر اٹھتے ہیں اور ان کے اضطراب کی لہریں ملک کے گوشے گوشے سے آ آ کر ایوانِ اقتدار سے ٹکراتی ہیں تو ایوان کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں۔ کیا سلہری صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ دستور کے مسئلے پر پوری قوم نے یک آہنگی سے پچھلے سات سالوں میں کیا تمنائیں دستور یہ اور حکمران پارٹی کے سامنے رکھی ہیں؟ کیا سلہری صاحب ناواقف ہیں کہ مارشل لاء کے اسیروں کے بارے میں ملک کی کوئی تنظیم اور کوئی بستی ایسی نہیں رہی جس کی طرف سے صریح بے انصافی کے ازالہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو؟ پھر ان اصل اتھارٹی اور اختیار رکھنے والے عوام کو کیا جواب ملا؟

اب تو عوام کے متعلق ذمہ دار ترین لوگوں کی طرف سے کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا ہے کہ یہ جمہوریت کے اہل نہیں، معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے، مذہبی رو میں بہہ جاتے ہیں اور بہکانے والوں کے ہاتھوں میں کھیل جاتے ہیں جن عوام کو یہ سنہرا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہو، ان بیچاروں پر فائنل اتھارٹی ہونے کا الزام بہت ہی بڑی زیادتی ہے۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا — یہ اگر آپ لوگوں کی ہر بات پر ایمان لے آیا کریں تب تو یہ فائنل اتھارٹی ہونے کے حق دار ہوں بھی، لیکن جب یہ اپنے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور کوئی صدائے اختلاف بلند کر دیں تو پھر یہ جمہوریت سے نوازے جانے کے مستحق ہی نہیں رہتے۔

فی الواقع اگر آپ لوگ عوام کو آخری فیصلہ کن طاقت قرار دیتے ہیں تو آیئے، آج آیئے اور اپنے نظریات و تصورات کو آپ ان کے سامنے رکھ دیجیے اور دوسری طرف تمام دوسرے لوگوں کو موقع دیجیے کہ وہ بھی اپنے اپنے نظریات و تصورات پیش کر دیں۔ ایک کھلے کھلے استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کرا لیجیے کہ آخری فیصلہ کن طاقت کس کو قبول کرتی ہے اور کسے رد کرتی ہے۔

(۳)

اب بحث کا تیسرا حصہ سامنے آتا ہے اور اصل نتیجہ برآمد ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ جو سبق سلہری صاحب پاکستان کو دینا چاہتے ہیں وہ اس حصے میں دیا جا رہا ہے۔ اس نتیجے یا سبق کے دو جزء ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نام پر سیاست کے میدان میں کسی کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کے نظریات دوسروں پر ٹھونسے نہ جائیں۔ بحث کے حصے میں بھی ان دو نکات کو پیش کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن کا ناقدانہ جائزہ لینا مفید ہوگا۔

سیاسی تنظیمیں اسلامی نہ ہونی چاہئیں | سلہری صاحب بتاتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کو باہم دگر اختلاف و تنقید سے کام لینا پڑتا ہے

اور اس بنا پر بسا اوقات برا بھلا کہنا پڑتا ہے۔ مثلاً انگلستان کے ٹوری سوشلسٹوں کو انتشار پسند (ANARCHIC) اور نظم دشمن قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف سے پلٹ کر اعتدال پسندوں (CONSERVATIVES) کو خون چوسنے والے سرمایہ دار کہا جاتا ہے۔ اب بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ایک سیاسی تنظیم اسلام کی علمبردار بن کے اٹھے، مثلاً جماعت اسلامی، تو وہ اپنے مخالفین کو کیا کہے گی؟ جس گالم گلوچ سے یہ اپنے دائرے سے باہر کے لوگوں کی تواضع کر سکتی ہے وہ کافر اور ملحد کہنے کے علاوہ اور کیا ہو گی! یہ پیچیدہ مسئلہ پیش کرتے ہوئے سلہری صاحب اس کے عملی ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کر گئے ہیں کہ جماعت اسلامی آئے دن اختلاف کرنے والوں کے لیے یہی کلمات استعمال کرتی رہتی ہے، چنانچہ مسودۂ دستور میں ترمیم چاہنے والوں کے خلاف اس کے ترجمان نے ٹھیک یہی انداز اختیار کیا تھا۔

پہلے اس عملی ثبوت کے بارے میں بات کر لینا ضروری ہے۔ مارچ ۵۳ء میں مسودۂ دستور میں ترمیم کرانے کے لیے نہیں بلکہ دستور ہی توڑ دو کا مشہور نعرہ متحدہ محاذ کی طرف سے اٹھا تھا۔ اس نعرے کے بارے میں خود مسلم لیگی اور سرکاری اور قوم پرست حلقوں نے یہی تاثر دیا تھا کہ یہ کچھ کمیونسٹوں، تخریب پسندوں، مفاد پرستوں اور اسلامی دستور کے مخالفوں کا اٹھایا ہوا نعرہ ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کمیونسٹ اور اسلامی دستور سے چڑنے والے عناصر جہاں جہاں بھی تھے انھوں نے اس کی تائید میں پورا زور صرف کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے ایک قرارداد میں اس تخریبی نعرہ کی تردید کرتے ہوئے اس کے علمبردار عناصر کو محض ایک واقعہ ہونے کی حیثیت سے پیش کر دیا تھا کہ یہ آواز کیسے لوگوں کی ہے۔ درحقیقت اس انتباہ کا مقصود صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے اٹھائے ہوئے نعرے کی گہرائیاں عام لوگ سمجھیں اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی اخلاص یا غلط فہمی کے تحت اسے اختیار کرتا جائے۔ اس پر ایک مذہبی گالی چسپاں ہوتی چلی جائے۔ دوبارہ یہی نعرہ اکتوبر میں اٹھا تو پھر اس کی پہلی "ہُو" انھی صفوں سے بلند ہوئی جن کو مارچ سے لوگ جانتے تھے۔ اب یہ تو "اسرار درون پردہ" کا معاملہ تھا کہ اقتدار کے لیے کشمکش کرنے والے دو دھڑوں میں سے ایک نے اندر ہی اندر اس ردّ شدہ نعرے سے کوئی مفید کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس نعرے کے جھنڈے تلے بڑے بڑے حضرات کا جو انبوہ جمع ہو گیا تھا ان میں سے ہر ایک خواہ مخواہ ان الفاظ کو اپنے اوپر اوڑھ کر مظلومی کی شان سے سامنے آتا ہے کہ دیکھیے جماعت اسلامی والے اپنے سوا دوسروں کو ملحد اور کمیونسٹ کہتے ہیں۔ بھائی کسے معلوم تھا کہ آپ جیسے اسلام نواز حضرات بھی اب اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے جسے گاڑنے والوں نے جب گاڑا تھا تو خود آپ ہی کی صفوں سے ان کو کمیونسٹ اور ملحد کہا گیا تھا۔

اب لیجیے، جماعت اسلامی کی روش کو۔ جماعت کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مجرد اختلاف کرنے کی بنیاد پر کسی بھی مومن کو کافر یا ملحد یا کچھ اور کہے۔ وہ اپنے آپ سے ہر فرد بشر کو اختلاف کا کھلا حق دیتی ہے، اور دوسروں کے مقابلے میں یہی حق اپنے لیے چاہتی ہے۔ اختلاف جیسا کسی سے ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ اس کی فکری پوزیشن کو بیان کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی جمہوریت کے کسی اصول سے انحراف کرتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جمہوریت کی مخالفت ہے۔ قانون وعدل کے صریح تقاضوں سے کوئی روگردانی کرتا ہے تو وہ فقط یہی کہتی ہے کہ یہ انصاف اور قانون کا عدمِ احترام ہے۔ کوئی معاشی دائرے میں استحصال کرتا ہے تو وہ یہ کہتی ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ اطوار ہیں۔ نہ یہ کہ وہ ہر اختلاف پر دوسروں کو کافر اور ملحد کہہ ڈالتی ہو۔ پھر جہاں تک تکفیر کے الزام کا تعلق ہے، اس سے جماعت کا دامن قطعاً پاک ہے۔ "ملحد" اور "کمیونسٹ" کے الفاظ البتہ ایسے ہیں جو اپنے ناگزیر موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ الحاد اس کو کہتے ہیں کہ اسلام کو مانتے ہوئے آدمی اس میں ٹیڑھ نکالے اور انحراف کی کھلی کھلی صورتیں اختیار کرے۔ اب سلہری صاحب اپنے معاشرے کو سامنے رکھ کر بتائیں کہ کیا یہاں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ ایسے بے شمار افراد موجود نہیں ہیں جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی نظام کو ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں، اسلام کے دستوری تصورات پر پھبتیاں کستے ہیں، اس کے عملی تقاضوں سے فرار کرنا چاہتے ہیں اور اس کے اجتماعی مطالبات کو رد کرتے ہیں؟ اگر سلہری صاحب چاہیں تو ہم نام لے کر ان ممتاز ہستیوں کا تعارف کرا دیں جو پاکستان کے اسلامی ریاست قرار پانے کی صورت میں شرم کے مارے اپنی گردن دنیا کے سامنے اٹھانے کے قابل نہیں رہتے، جو "قراردادِ مقاصد" کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والے ہیں کہ جیسے پاکستان کے دامنِ عزت پر کوئی گھناؤنا دھبہ لگ گیا ہے، جن کا حال یہ تھا مسودۂ دستور میں ریاست کے تسمیہ (NOMENCLATURE) کی دفعہ نے جب پاکستان کا نام "جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان" تجویز کر دیا تو وہ پیچ و تاب کھاتے رہ گئے۔ آخر جب یہ عنصر ہمارے ہاں موجود ہے اور جب کمیونسٹوں کی ایک تعداد یہاں کام کر رہی ہے تو کوئی بھی کام کرنے والی جماعت ان کے موجود ہونے سے کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور کیسے ان کی حرکات سے چشم پوشی کر سکتی ہے۔ یہ عناصر اگر کوئی اقدام اپنے نظریات کے مطابق کریں گے تو اس کام کو انھی سے منسوب کیا جائے گا، نہ یہ کہ ملحد اور کمیونسٹ عناصر کے کارناموں کو جمعیت العلماء اور مسلم لیگ کے نام سے بیان کیا جائے۔ ان عناصر کے لیے آخر آپ کونسا نام تجویز کر کے دیتے ہیں کہ اس سے ان کو موسوم کر کے بات کی جائے۔

اصل الجھن جس وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرزِ فکر اور ہر مسلک کے لوگ اپنے آپ کو جرأت کے ساتھ ایسے نام سے پیش کرتے اور ایسے نام سے موسوم ہونا چاہتے ہیں جو ان کے طرزِ فکر اور مسلک کو ظاہر کرتا ہو۔ لیکن ہماری صفوں میں ملحد اور کمیونسٹ، دونوں ہی عنصر یہ عجیب پوزیشن اختیار کرکے رہنا چاہتے ہیں کہ وہ خیالات، طرزِ عمل اور سرگرمیوں کے لحاظ سے تو الحاد اور کمیونزم کے علمبردار ہیں لیکن اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو ملحد اور کمیونسٹ کے نام سے سامنے نہیں لاتے۔ اب اگر کوئی دوسرا ان کے خیالات اور مسلک کے نام سے ان کا صحیح نام لے دیتا ہے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتے ہیں کہ تم اختلاف کرنے والوں کو گالی دیتے ہو! معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک مسلم معاشرہ میں اپنا کام منافقت کی ایک نقاب ڈال کر جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی اس نقاب کو سرکاتا ہے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ــــــ اسلامی نظام کے خلاف صریح طور پر بغض رکھنے والے، اسلامی دستور کا ذکر چھڑتے ہی پسینہ پسینہ ہو جانے والے اور کتاب و سنّت کا نام آتے ہی اشتعال پذیر ہو جانے والے سب کے سب یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور طرزِ فکر کے لحاظ سے ہرگز نہ پہچانے جائیں، بلکہ اسلام کے مخلص ترین خادموں میں شمار ہوں۔ سلہری صاحب! یہ پردۂ منافقت ہے جو اصل پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ہٹا دیجیے تو کوئی الجھن نہیں ہو گی۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو صاف صاف طریق سے اگر اسلامی نظام کی دعوت کے ساتھ لا رہے ہیں، تو کیوں نہ کچھ دوسرے لوگ کھلم کھلا اسلامی نظام کی مخالفت کا علم اٹھا کے میدان میں کام کریں اور کہیں کہ ہم ملحد اور کمیونسٹ ہیں، ایک مادہ پرستانہ سیکولر نظام چاہتے ہیں، ہمیں اسلام وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یوں اگر رائے عام کے کھلے میدان میں مسابقت رہے تو بہت آسانی سے اِدھر یا اُدھر فیصلہ ہو سکتا ہے۔

"جماعت اسلامی" کا نام بحث کا یہ پس منظر بنا چکنے کے بعد سلہری صاحب جماعت اسلامی کے نام پر اعتراض اٹھاتے ہیں اور وہ شاندار استدلال کرتے ہیں کہ آدمی عش عش کر اٹھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نام کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام لوگ اسلام کے دائرے سے باہر ہو گئے۔ جی ہاں! مسلم لیگ نام کی اگر ایک جماعت موجود ہو تو وہ گویا یہ کہتی ہے کہ اور جتنی بھی جماعتیں ہیں وہ مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہیں۔ اگر ایک جمعیت العلماء موجود ہو تو وہ گویا اپنے نام کے ذریعے یہ اعلان کرتی ہے کہ باقی سب جمعیتیں "جہلاء" کی ہیں۔ کوئی ادارۂ خدمتِ خلق موجود ہو تو گویا یہ نام رکھ کر وہ دوسرے تمام اداروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ سب خدمتِ نفس کے ادارات ہیں۔ اسلامیہ کالج اگر کوئی

پایا جائے تو وہ گویا پکار پکار کر دوسرے تمام کالجوں کا غیر اسلامی ہونا واضح کرتا ہے۔ "طلوعِ اسلام" نام کا کوئی جریدہ نکلے تو اس کا سرورق گویا دوسرے تمام جرائد کو "طلوعِ کفر" کا افق قرار دیتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کو چھوڑ کر اسی دلیل سے افراد کو لیجیے تو ماننا پڑے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنا نام غلام محمد رکھ لیا ہو تو گویا وہ دوسرے کروڑوں بھائیوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ محمد ﷺ کے نہیں، کسی اور کے غلام ہیں۔ اگر کسی کا نام عبداللہ ہو تو وہ دوسروں پر بالواسطہ طریق سے یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ عباد الشیطٰن ہیں۔ کوئی شخص اگر "سعادت" اپنا تخلص اختیار کر لے تو باقی دنیا پر نحوست کا تخلص خواہ مخواہ چپک جائے گا۔ یہ دلیل بازاری سطح کے لوگوں سے تو پہلے بھی سنی تھی لیکن اس پر بڑی مایوسی ہوئی کہ پاکستان کا ایک ممتاز اخبار نویس بھی اس کو ایک برہانِ قاطع بنا کے لے آیا۔ اس برہانِ قاطع کی بنیاد پر سلہری صاحب چاہتے ہیں کہ "جماعت اسلامی" کے نام کو ممنوع (BAN) ٹھہرا دیا جائے۔ دلچسپ امر یہ کہ وہ یہ بھی اجازت مرحمت فرماتے ہیں، بلکہ کچھ اصرار بھی کرتے ہیں کہ ہماری جماعتوں کا پروگرام اسلامی اصول و مقاصد سے مالامال ہونا چاہیے، لیکن بس وہ "اسلامی" نہ کہلائیں، مٹھائی بنائیے، اس میں شکر ضرور ملائیے، اسے خوب میٹھا کر لیجیے لیکن اس کا نام مٹھائی نہ رکھیے۔ بلکہ حنظل رکھیے ورنہ اگر آپ نے اپنی مٹھائی کا نام کہیں مٹھائی رکھ لیا تو آپ دوسروں کی مٹھاس کی نفی کرنے کے مجرم بن جائیں گے۔ آپ ایلوپیتھک دواؤں کی دکان کھولیں تو اس کے بورڈ پر یہ واضح نہ کریں کہ یہاں ایلوپیتھک دوائیں ملتی ہیں، بلکہ باہر یہ لکھیے کہ یہاں سے بھوسہ اور چارہ مل سکتا ہے۔

دنیا میں نام ہمیشہ حقیقتِ شئے کو واضح کرنے کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔ پارٹیوں اور جماعتوں کے نام ان کی فکر اور ان کے پروگرام کو پیش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں یہ لطائف کبھی نہیں پیش آئے کہ کمیونسٹ، سوشلسٹ، جمہوری یا کسی اور نظریہ کی جماعت کو مطابقِ حقیقت ناموں سے موسوم کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہو تو آخر ایک اسلامی نظریہ رکھنے والی تنظیموں ہی کے لیے یہ طرفہ قانون کیوں گھڑ لیا جائے۔ کب جماعتِ اسلامی نے آپ کو منع کیا ہے کہ آپ اگر اسلامی نظریہ پر کام کرنا چاہیں تو اپنی کسی تنظیم کو اسلام سے منسوب نہ کریں۔ اسلامی نظریہ کی علمبردار اگر یہاں درجنوں جماعتیں بھی ابھر آئیں تو وہ ایک مقصد کے خادموں کی متعاون ٹیمیں بن کر کیوں نہیں کام کر سکتیں! ہم تو سلہری صاحب کو دعوت دیں گے کہ وہ جس تصور کے ساتھ بھی اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، بسم اللہ کریں اور ایک اور اسلامی جماعت کی بنیاد ڈال دیں۔ اس میں جماعت اسلامی کا نام بے چارا کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اگر حقیقتِ شئے کو کسی لمبے ڈھینگے نام سے

موسوم کر دیا جائے تو بالآخر وہ نام خود ہی اپنے معنی بدل دیتا ہے، مثلاً اگر جماعت اسلامی کا نام آپ کوہِ ہمالیہ بھی رکھ دیں گے تو خود لفظ کوہ ہمالیہ کے معنی ایک دن جماعت اسلامی ہو کے رہ جائیں گے۔

جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے معنی لیکن اصل مدعا نام کو نہیں، بلکہ اس نام کے بہانے جماعت اسلامی کی تنظیم اور تحریک کو خلاف قانون قرار دلوانے کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ سلہری صاحب شوق سے یہ مہم شروع کریں لیکن وہ اپنے مرتبے کا کچھ تھوڑا بہت لحاظ کر کے یہ سوچیں کہ اس قسم کی بات زبان پر لانے کے معنی کیا ہیں۔ ایک جماعت کو خلاف قانون قرار دینا درحقیقت اس کے قتل کا معنی رکھتا ہے۔ جماعت کا قتل ایک نظریے، ایک نصب العین اور ایک پروگرام کو پھانسی دینا ہے۔ آخر وہ یہ پھانسی کس بنیاد پر کسی کو دلوانا چاہتے ہیں ــــ محض اختلافِ رائے کے گناہ پر! تو پوزیشن وہی ہوئی جیسے کسی علاقے کا کوئی جابر جاگیردار جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں خود دار آدمی چونکہ میرے دربار میں آکر میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور برسرِعام مجھ سے اختلافِ رائے ظاہر کرتا ہے تو وہ پیچ و تاب کھا کر اس کے قتل کرانے کی سازش پر اتر آتا ہے۔ خود قتل نہیں کر سکتا تو کسی دوسرے کی منت سماجت کرتا ہے کہ کسی طرح یہ کانٹا نکال دو۔ سلہری صاحب غور کریں کہ اگر اپنی پوزیشن کو وہ اختیار کرنے والے تھے تو آخر پورے اداریے میں جگہ جگہ آزادیٔ رائے کا وعظ کہنے کی تُک کیا بیٹھی؟

رواداری کی ضرورت پر اتنا کچھ کہہ ڈالنے کے معنی کیا رہے؟ جمہوریت نوازی کے سارے حوصلوں کی پرواز بس اتنی ہی تھی؟

جاگتے ہوئے ضمیر کے ساتھ سوچیے کہ آخر ان یہودیوں کی کرتوت آج ہم سے کس بنا پر خراجِ نفرین وصول کرتی ہے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سولی کی سزا تجویز کی تھی؟ ان جبارانِ زمانہ کے کارناموں کو آج ہم حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں جنھوں نے انسانیت کے بہترین خادموں کو استبداد کے کولھو میں پیل دیا تھا؟ یورپ کے قرونِ مظلمہ کے ان تنگ دل حکام اور پادریوں کو ہم کیوں کوستے ہیں جنھوں نے گلیلو اور نیوٹن جیسے اہلِ فکر پر جینا تنگ کر دیا؟ ہم ان یونانیوں کو کیوں کڑھن کے ساتھ یاد کرتے ہیں جنھوں نے سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا؟ ہم ان علمائے سُو کا نام کیوں ذلت آمیز طریق سے لیتے ہیں جنھوں نے مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں بیٹھ بیٹھ کر ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف فتوے لگائے، چغلیاں کھائیں اور قابو چل گیا تو اس کو موت یا قید خانے کے حوالے

کرکے چھوڑا؟ ان لوگوں کا گناہ صرف تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کی برداشت اپنے اندر پیدا کرنے کے بجائے یہ پسند کیا کہ انسانیت کے جو اونچے سے اونچے خادم ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں نے کلمۂ حق کہنے والوں، آزادیٔ رائے کا مظاہرہ کرنے والوں اور تنقید کی صدا بلند کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بہانے تراشے، بچگانہ استدلال گھڑے، نئی سے نئی منطقیں ایجاد کریں، مذہب اور قانون کی حسبِ منشا کوئی تعبیر پیدا کرلی اور منتخبِ روزگار ہستیوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔

اب دیکھیے کہ یہ آپ کا طبقہ ہے کہ جس کے قبضے میں تخت و تاج ہے۔ خزانے اور ذرائع و وسائل ہیں نشر و اشاعت کی طاقتیں ہیں، ریڈیو اور پریس ہے، پشت پر واحد نمائندہ جماعت ہے، حمایت میں بے شمار دماغ ہیں، پھر استبدادی قوانین و اختیارات ہیں، پولیس اور فوج ہے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی ہے کہ جو تھوڑی سی تعدادِ ارکان اور ان کی جیبوں سے نکلی ہوئی محدود سی رقوم اور ایک روزنامہ اور دو چار ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد کے بل پر ایک فکر پیش کر رہی ہے۔ اگر اس کی فکر غلط اور باطل ہے اور اس کا پروگرام مہلک ہے اور وہ واقعی نامعقول طریقوں سے کام لے رہی ہے تو آخر آپ کے اس طبقہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رواداری کی کھلی فضا میں اتنی ہمہ گیر طاقتوں سے کام لے کر اسے شکست نہیں دیتا۔ دلیل کے میدان میں کسی جماعت یا تحریک کو شکست دے دی جائے تو پھر چاہے چند سر پھرے آدمی اس سے کتنے ہی چمٹے رہیں وہ حالات پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے اور آہستہ آہستہ فاتح خیالات کی طاقت ان کو دھکیل کر زندگی کے بعید ترین گوشوں میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر اب کیا آپ لوگ دلیل کا میدان واقعی چھوڑ چکے ہیں کہ نوبت جماعت اسلامی کے قتل کے بہانے پیدا کرنے تک آپہنچی ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں آپ کا یہ اداریہ پڑھا جائے گا، اغیار پاکستان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ ہمارے معیارِ جمہوریت اور ہمارے ہاں کی رواداری اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے ظرف کے بارے میں لوگ کیا اندازے باندھیں گے؟

سوچیے، اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ کا یہ حکمران طبقہ وہ ہے کہ جس کی طرف سے جماعت اسلامی کو پچاسوں بار غدار اور تخریب پسند کہا جا چکا ہے اور انڈیا، روس اور امریکہ میں سے ہر ایک کا روپیہ پروپیگنڈا کی حد تک کئی کئی بار دلوایا جا چکا ہے۔ ہم تو یہ سب کچھ سہتے چلے آرہے ہیں، بلکہ اس سے اوپر یہ کہ سیفٹی ایکٹ کے وار، پھانسیوں اور قید کی سزائیں، ضبطیاں اور زبان بندیاں اور قلم بندیاں سب کچھ صبر سے بھگت رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ایک "جماعت اسلامی" کا نام

اتنی ناقابلِ برداشت چیز ہو گیا ہے کہ آپ جیسے ممتاز صحافی اسے خلافِ قانون قرار دینے کے دلائل ادارتی صفحات میں پیش کرنے لگے ہیں۔ خدارا سوچیے کہ آج جو تاریخ بن رہی ہے اس میں اپنے لیے کیا مقام آپ پیدا کر رہے ہیں۔

مغرب زدہ ذہن سلہری صاحب کی اس جرأت کی ہمارے دل میں بہت قدر پیدا ہوئی کہ آپ نے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ ذہنوں پر غیر ملکی راج اور مغربی فکر و تہذیب کا گہرا اثر موجود ہے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اور معاشرے کے تعلیم یافتہ عنصر کا اس پہلو سے ڈیفنس کرنے کے بعد فوراً آپ نے دوسری جانب جارحانہ حملہ کر دیا ہے۔ یعنی مذہبی لوگوں کو جدید علوم سے بے بہرہ اور حالات کے تقاضوں سے ناآشنا قرار دے دیا ہے۔ اس موقع پر بھلا مولانا مودودی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مولانا احتشام الحق کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کا نام لے کر ان کی علمی حیثیت پر استفہامِ انکاری فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سطح پر جا نہیں سکتے کہ کسی کی جہالت اور کسی کی علمیت کا ناپ تول کر سکیں۔ علم اگر کہیں ہو گا تو اپنا اعتراف خود کرائے گا، نہیں ہو گا تو محض نام کے سکے دیر تک نہیں چل سکتے۔ رنج ہوتا ہے کہ یہاں آ کر سلہری صاحب نے ایسی پوزیشن اختیار کی ہے کہ جیسے دو طبقوں کا کوئی طبقاتی جھگڑا ہے اور سلہری صاحب ایک طبقے کے بالمقابل دوسرے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اگر حالات کو انہوں نے واقعی اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ملا اور مسٹر کی کشمکش ہے تو قطعی طور پر غلط سمجھا ہے، کم سے کم جماعت اسلامی کی حد تک اگر ان کو پہلے سے معلومات نہیں ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس کی صفوں میں دونوں طرف کے لوگ آ کر جمع ہوئے ہیں، بلکہ جدید طبقے کے حلقوں سے نسبتاً بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگ بعض اوقات معیاری علماء کی تعداد کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی بیّن ثبوت ہے، اس بات کا کہ کشمکش طبقاتی نہیں ہے، ورنہ جماعت اسلامی کے لیے جدید طبقوں کے دروازے طبقاتی تعصب نے کبھی کے بند کر دیے ہوتے۔ معاملہ درحقیقت نہایت زوردار تاریخی تقاضوں اور مستقل نظریوں کی کشمکش کا ہے جسے ہم آخر میں مختصراً واضح کریں گے۔

خیر، اسی سلسلے میں فاضل مدیر اقبال کا ذکر چھیڑتے ہیں کہ ایسے چوٹی کے لوگ تو شاذ ہی ہو سکتے ہیں جو ایک ماحول میں پرورش پا کر اور ایک نظامِ تہذیب کے تحت تعلیم حاصل کر کے اٹھیں اور پھر آزادانہ ذہن کے ساتھ اسی کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتے اور اس کے بالمقابل ایک نئی فکر پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیں۔ سب لوگ واقعی اس درجے کے نہیں ہو سکتے، لیکن قدرت ایسے ممتاز افراد سے قوموں کو اسی لیے نوازتی ہے کہ اوسط درجے کے دل و دماغ جو از خود ماحول اور وقت کی

تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتے اور ان سے اوپر اٹھنے کے لیے کوئی فکر از خود حاصل نہیں کر سکتے، وہ خاص خاص تاریخی شخصیتوں کی فکر سے اپنے چراغ روشن کریں۔ لیکن آپ اقبال کو اٹھا کر غیر معمولی پن کے اونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول اور تاریخ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ہر کوئی اقبال تو نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ہر کوئی روسو اور مانٹسکیو اور گاندھی اور محمد علی جناح نہیں بن سکتا، مگر اِن سے فکر و عمل کا درس تو لے سکتا ہے۔

اقبال مرحوم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملّتِ اسلامیہ کے اُس دوگونہ تاریخی ردِّ عمل کو سمجھ کر اپنے کلام میں جذب کر لیا جو گذشتہ ایک صدی سے مغرب کے سیاسی و تہذیبی غلبے کے تحت پروان چڑھا۔ ایک طرف اُس نے دورِ جدید کے مطالعہ سے علم و عمل کے میدانوں میں ترقی کرنے، حالات سے کشمکش کرنے، قوتوں کو مسخر کرنے، جدید ذرائع و وسائل سے کام لینے اور جدید ادارت سے استفادہ کرنے کا وہ سبق لیا جو خود اسلام کا پڑھایا ہوا سبق تھا۔ دوسری طرف اُس نے نظامِ حیات کی بنیاد بنانے کے لیے مغرب کی مرعوبیت سے بالاتر ہو کر اسلامی اصولِ فکر کو بغیر کسی ندامت و معذرت کے اپنایا۔ یہ دونوں تاریخی رجحانات خود ملت اسلامیہ کے اندر مغربی غلبے کے ردِّ عمل سے پیدا ہو کر نمایاں ہو رہے تھے مگر دھندلے اور نیم شعوری تھے۔ اقبال نے ان کو اجاگر کر دیا اور اس طرح اس کے کلام نے تعمیرِ نو کے لیے ایک صحیح راستے کی نشان دہی کر دی۔ اس لحاظ سے اقبال کو دیکھیں تو وہ ہمارے قدیم مذہبی طبقے اور جدید روشن دماغ طبقے کے درمیان ایک ایسے وسطی مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جہاں دونوں اپنے آپ کو لا کر جمع کر سکتے ہیں اور ملت کی ساری طاقت یک جہتی سے تعمیرِ نو میں لگ سکتی ہے۔

اقبال اس وسطی مقام پر کھڑے ہو کر ایک فکری تحریک کر کے رخصت ہو گیا۔ بعد میں ٹھیک وہی موقف ہے جسے عملی تحریک کے میدان میں جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ ورنہ اگر معاملہ مسٹر اور ملا کی طبقاتی کشمکش تک رہ گیا ہوتا تو اس سے پہلے دونوں طرح کی جماعتیں اور ادارات موجود تھے، تاریخ میں کوئی خلاء نہ تھا۔ کسی جماعت اور تحریک کے لیے اگر خلاء تھا تو اسی ضرورت کے لیے تھا کہ دونوں قسم کے متصادم رجحانات کے درمیان کوئی طاقت اقبال کا نشان زدکردہ مقامِ اعتدال سنبھال کے کھڑی ہو۔ چنانچہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ایک طرف جدید علوم میں آگے بڑھنے، جدید ادارات سے استفادہ کرنے اور جدید ذرائع و وسائل کو کام میں لانے اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے اور ان کا لحاظ رکھنے کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تعمیرِ نو اسلامی فکر و اصول

کی اساس پر ہو۔ پس درحقیقت جماعت اسلامی ایک تاریخی تقاضے کا ظہور ہے اور یہ تاریخی تقاضا اتنا ملّت گیر ہے کہ ہر ملک میں یہ کسی نہ کسی تحریک کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے۔ اتنی بات البتہ درست ہے کہ یہ ہمہ گیر تاریخی تقاضا رائے عام کی پوری تائید اپنے ساتھ لے کر جس بھی شکل میں جہاں نمودار ہو رہا ہے، حکمراں کلاس بہت برافروختہ ہو کر اس سے لڑ رہی ہے یعنی معاملہ مسٹر اور ملا کی کشمکش کا نہیں، بلکہ عوامی رجحانات اور حکمراں کلاس کی کشمکش کا ہے۔ کاش کہ اگر یہ طبقہ کشمکش کا راستہ اختیار نہ کرے تو تعاون کے لیے خطِ اعتدال سامنے موجود ہے۔

ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی | اس سلسلے میں فاضل مدیر نے "ایک متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" دینے پر اعتراض کیا ہے موصوف کی رائے یہ ہے کہ بس لوگ قرآن پڑھیں اور جدید علوم کے حصول میں لگ جائیں، جوں جوں افراد کے خیالات بنیں گے، ریاست اور معاشرہ ان کے ذریعے خود بخود اپنے آپ کو کسی شکل میں تعمیر کرتا جائے گا۔ اس سلسلۂ کلام میں آپ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ آنے والی نسلوں کو نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جائیں اگر آپ ان بیڑیوں میں آئندہ نسلوں کو جکڑ جانے کا حق نہیں رکھتے تو آخر نام نہاد غیر اسلامی قوانین کی بیڑیوں میں جکڑ جانے کا حق کہاں سے حاصل ہو جاتا ہے! پھر تو چاہیے کہ آپ معاملہ بالکل ہوا میں معلّق چھوڑ دیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آئندہ نسلوں کے نام پر موجودہ نسلوں کو ان قوانین سے محروم رکھنا برحق ہوگا جس پر وہ ایمان رکھتی ہیں اور جن کو فلاح و بہبود کا ضامن سمجھتی ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں موجودہ نسلیں ان پر ایمان نہیں رکھتیں۔ لیکن اس اختلافِ رائے کا فیصلہ کون کرے گا؟ — اگر وہی عوام فیصلہ کرنے والے ہیں جن کو آپ آخری اتھارٹی قرار دیتے ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ براہِ کرم اپنا یہی فقرہ، بلکہ اپنے یہ الفاظ "نام نہاد اسلامی قوانین کی بیڑیاں" قوم کے سامنے پیش کر کے استصواب کر لیجیے کہ کتنے افراد اس ملک میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اس طرز پر سوچتے ہیں اور یہ الفاظ اسلامی قوانین کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں جو ذہن بول رہا ہے، عوام کے کتنے ووٹ اس ذہن کے حق میں پڑ رہے گے۔ لیکن آپ کی توجہ ان الفاظ کو لکھتے وقت عوام کی طرف کبھی نہیں ہو سکتی، آپ نے تو اپنی طرف سے ایک قطعی فیصلہ دے دیا ہے اور انداز ایسا ہے کہ اسے زبردستی ملک بھر پر ٹھونسنا چاہتے ہیں

"متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی" کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک کوئی بات محض خطابت و صحافت کے میدان میں کی جاتی رہتی ہے، قطعیت اور تعین کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن جب معاملہ دستور بنانے، تعمیرِ معاشرہ کا خاکہ تیار کرنے اور ایک سیاسی نظام برپا کرنے کا ہوتا ہے تو ڈھیلی ڈھالی باتوں کو قطعیت اور تعین کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ فکر

و دعوت خود تعین کی طرف نہ جانا چاہیے اور محض اصولی گفتگو تک اپنے آپ کو محدود رکھے تو مخاطب خود تعین کا تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً یہی صورت عملاً جماعت اسلامی کو پیش آئی۔ اس نے کہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جانا چاہیے۔ اس پر سوال ہوا کہ تفصیل سے بتایئے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ ادھر سے کہا گیا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بننا چاہیے۔ دریافت کیا گیا کہ وہ اسلامی بنیادیں کیا ہوتی ہیں۔ چاہا گیا کہ معاشی مفاسد کی اصلاح اسلامی نظریات کے مطابق کی جائے۔ اس پر پوچھا جانے لگا کہ وہ اسلامی نظریات کیا ہیں اور ان سے معاشی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔ پھر جب دعوت دی گئی کہ سود کو حرام ہونا چاہیے تو جرح ہوئی کہ اس کے بغیر بنکنگ سسٹم کے لیے کیا نقشہ دیتے ہو۔ اسی طرح کرید اور تفحص اور کثرتِ سوال نے آہستہ آہستہ پھیلے ہوئے نظریات کو تعین تک پہنچایا ہے اور یہ بالکل فطری صورت دورِ تعمیر میں دنیا کے ہر گوشے اور زمانے میں پیش آئی ہے۔ خود ہی آپ لوگوں نے پہلے اس تعین کے لیے ہر معاملے میں اصرار کیا اور اب خود ہی طعنہ دیتے ہیں کہ ہمیں کوئی متعین سیاسی و اجتماعی رہنمائی نہیں چاہیے۔ ہم تو گول مول باتیں پسند کرتے ہیں۔ گول مول باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی۔ ایک متعین رہنمائی آپ کو پسند نہیں آئی تو آپ کوئی دوسری متعین رہنمائی بہم پہنچائیں اور پھر فیصلہ عوام پر چھوڑ دیں۔ خود کوئی متعین چیز دے نہیں سکتے اور دوسروں سے لینے پر تیار نہیں۔ اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟

(۴)

اداریے پر تبصرہ ہو چکا، لیکن آخر میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ سلہری صاحب کے چھیڑے ہوئے مسائل کی گہرائی میں اتر کر اصل قابلِ حل مسئلہ کو سامنے لائیں۔ سلہری صاحب اپنے اداریے میں اس وسیع موضوعِ فکر کو صرف باہر ہی باہر سے مس کر سکے ہیں لیکن اس کے اندر اتر نہیں سکے، کیونکہ درحقیقت ان کی تمام تر توجہ ہمارے اہم ترین تاریخی و ملّی پرابلم سے پیدا ہونے والی سطحی بحثوں پر مرتکز رہ گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس بھاری پرابلم پر نگاہ ڈال کر اسے سمجھ سکے ہوں۔

ملّتِ اسلامیہ پچھلے دو تین قرنوں سے غلامی کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی کرہ ارضی کے ہر گوشے میں آزادی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ آزادی کا آفتاب جب کسی سرزمین پر چمک اٹھتا ہے تو احساسات جاگ اٹھتے ہیں، ولولے کروٹیں لیتے ہیں، عزائم ابھرنے لگتے ہیں اور جو کچھ فکر و شعور پیچھے سے بندھا چلا آیا ہو وہ زندگی کی باگ ڈور تھامنے کے لیے میدان میں آجاتا ہے۔ پاکستان بھی آزادی کی صبح سے دوچار ہے۔ قدرتی طور پر اجتماعی زندگی حرکت اور اقدام اور نشوونما چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے کہ جب پیدا ہو جاتی ہے تو خیالات کی رَو کو اس جگہ روک کر نہیں رکھا جا سکتا جہاں وہ پہلے سے یخ بستہ ہو کر کھڑی تھی۔ صبح کی شعاعوں کی گرمی نے برف کو پگھلا کر سیّال بنا دیا ہے اور

ہر سیال چیز بہنا چاہتی ہے۔ آزادی نے ارادوں کو جگا دیا ہے اور ہر جاگتا ہوا ارادہ اقدام کرنا چاہتا ہے۔ جس حالت میں ہم آج کھڑے ہیں اس پر کسی ایک فرد کے اندر بھی اطمینان باقی نہیں رہا۔ قوم کا اجتماعی ذہن تبدیلی چاہتا ہے۔ تاریخ کو ہم جکڑ بند کر کے موجودہ مقام پر کھڑا نہیں رکھ سکتے۔

لیکن اسے کس رُخ پر آگے بڑھنے کا راستہ بنا کے دیا جائے؟

سب سے پہلے مغربی فکر و تمدن کی کشش ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں اور شاید خیر خواہی ہی کے جذبے سے چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کو قدم بہ قدم اقوام مغرب کے پیچھے سیدھے مادہ پرستانہ فکر و تمدن کی راہ پر بڑھ جانا چاہیے۔ یہی راہِ ترقی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محض چند افراد — ذہین سے ذہین اور خیر اندیش سے خیر اندیش افراد — کا چاہنا اس معاملے میں فیصلہ کن نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی شعور و ارادہ تاریخی عوامل کے زیرِ اثر کیا میلانات اختیار کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے حالات پر کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی سطح پر پیرتے رہنے کے بجائے اس کی گہرائیوں کی غواصی کی جائے اور حکیمانہ غیر جانبداری سے کھوج لگایا جائے کہ اس سمندر کی تہہ میں کیا ہے جو اچھلنا چاہتا ہے۔

چند تاریخی حقیقتیں اس عظیم مسئلے کی تحقیق کے لیے اندر اتریئے تو چند اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ ہماری قوم مجموعی حیثیت سے اپنے مسلم ہونے کا احساس رکھتی ہے اور گہرا احساس رکھتی ہے۔ یہ احساس سخت درجے کے ناسازگار حالات میں بھی مٹ نہیں سکا بلکہ اس کی دور تک اتری ہوئی جڑیں برابر غذا حاصل کرتی رہی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جہاں بلحاظ ایمان و عقیدہ اسلام کا پیرو اور علمبردار ہونے کا یہ احساس مرا نہیں ہے، وہاں دوسری طرف یہ شعور بھی افراد اور معاشرہ کے اجتماعی ذہن میں موجود ہے کہ ہماری عملی زندگی اور ہمارا اجتماعی نظام اسلامی بہ حال نہیں ہے۔ فراری ذوق نے اس شعور سے بچنے کے لیے ہزار پناہ گاہیں گذشتہ صدیوں میں تعمیر کیں، لیکن اس شعور کے حملے کی زد سے بچنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اس شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن و حدیث کے مطالعہ نے اصل پارٹ ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان چونکہ اسلامی نظام کے دورِ سعادت کی زریں تاریخ کا ایک ایک باب نہایت محفوظ شکل میں سینوں سے لگائے چلے آ رہے ہیں اور یہ تاریخ جو ان کے لٹریچر، ان کے ادب، ان کی صحافت، ان کی خطابت میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہے، زندگی کے ایک ایک پہلو کے بارے میں — ان کو بول بول کے کہتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں انحراف

کارفرما ہے۔

تیسرے یہ کہ اس قوم کا یہ احساس و شعور محض زینتِ دماغ نہیں بنا رہا بلکہ اس نے بار بار ذوقِ تغیر اس کے اندر پیدا کیا ہے اور اس ذوقِ تغیر نے یکے بعد دیگرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اس کے دائرے میں برپا کر دی ہیں۔ ان تحریکوں کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا ہے کہ ذوقِ تغیر کی یہ لہر ہمیشہ موجود رہی ہے اور اپنا تاریخی اثر رکھتی ہے۔

چوتھے یہ کہ یہ مسلمان ہونے کا احساس اور عملاً اسلام سے ہٹے ہونے کا چھپا ہوا شعور ایسی موثر طاقتیں ہیں کہ مسلمان ان کے بل پر ایک ایک ملک میں امپیریلزم اور سامراج کے خلاف لمبی لڑائیاں لڑتے ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ جب بھی وہ متحد ہوئے ہیں، جب بھی متحرک ہوئے ہیں اور جب بھی انہوں نے قربانیاں دی ہیں اسلامی آئیڈیالوجی کی محبت میں دی ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے ان پر ثابت کر دیا ہے کہ یہی ان کی زندگی، ترقی اور سرگرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر چونکہ آزادی کو انہوں نے فی نفسہٖ نصب العین بنا کر کبھی بھی کام نہیں کیا بلکہ کھوئی ہوئی اسلامی زندگی کو پالینے کی تمنا میں آزادی کو ایک ذریعہ و وسیلہ کی حیثیت سے چاہا ہے اس لیے ہر جگہ تعمیرِ نو کے لیے سب کی نگاہیں اسی آئیڈیالوجی پر مرتکز ہیں۔

پانچویں یہ کہ مغربی فکر و تمدن کے تسلط نے دوسری ایشیائی قوموں کا ذہن جس طرح اپنے سانچے میں کامیابی سے ڈھال لیا ہے اور ان میں مادہ پرستانہ قومی سیکولر نظاموں کے لیے ایک واضح میلان پیدا کر دیا ہے، مسلمانوں پر اسے ویسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسلمان معاشروں پر اس کے گہرے اثرات پڑے ہیں اور چھوٹا موٹا ایک نہ ایک طبقہ ان میں مغربی اثرات کے سامنے بڑی حد تک مفتوح ضرور ہوا ہے، لیکن اسلامی آئیڈیالوجی کی ڈھال لے کر قوم کے اجتماعی ذہن و فکر نے اپنے آپ کو مغربی فکر و تمدن کے حملوں سے بچا لیا ہے۔ مسلمانوں میں مرعوبیت اور تقلید کا ایک حد تک پرتو ضرور پڑا ہے لیکن پوری طرح ہتھیار ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ مخالفِ اسلام اثرات کے خلاف برابر لڑ رہے ہیں اور یہ لڑائی جاری ہے۔

چھٹے یہ کہ مغربی فکر و تمدن کا تجربہ اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کے کمزور اور فاسد پہلوؤں کے نتائج اور بہت ہی تلخ اور تباہ کن نتائج ـــ ابھر ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ ان نتائج کی تلخی اور تباہ کاری کو خود اہلِ مغرب محسوس کر رہے ہیں اور نت نئی پیچیدگیوں کے پیش آنے پر وہاں کے اربابِ علم و حکمت خود پریشان ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات نے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کر دیا ہے۔

یہ ہیں وہ تاریخی حقیقتیں جن کے ہمہ گیر اثرات نے ہمارے اجتماعی ذہن میں اسلامی فکر اور اسلامی نظریے کو پوری مضبوطی سے جما دیا ہے۔ یہ قوم کہیں بھی ہو، نہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرسکتی ہے، نہ وطنی قومیت کو دل میں جگہ دے سکتی ہے نہ سیکولرازم کو قبول کرنے پر تیار ہوسکتی ہے، نہ مغربی فکر و تمدن کی اندھی تقلید کرسکتی ہے، نہ کمیونزم کو جذب کرسکتی ہے اور نہ موجودہ حالت پر نخ بستہ ہو کے پڑی رہ سکتی ہے۔ یہ قطعی طور پر اسلامی نظام زندگی ہی کی جانب رُخ کرکے نیا سفرِ حیات شروع کرسکتی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی ایک ملک کے لیے خاص نہیں، کرۂ ارضی کی تمام مسلمان آبادی اسی تاریخی کیفیت سے گذر رہی ہے۔ اسی تاریخی کیفیت نے ہر جگہ اسلامی تحریکیں برپا کردی ہیں۔

تضاد اور کشمکش سوال یہ ہے کہ پھر یہ حرکت کیوں نہیں شروع ہوتی، اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ ہر جگہ قیادت کی باگ ڈور پہلے سے ایسے ایک طبقے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ تو اپنے مناصب اور مفاد کی خاطر اور کچھ اپنے مغرب سے قبول کردہ جدید نظریات کے زیرِ اثر اجتماعی ذہن کے تاریخی رجحانات کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہ طبقہ عوامی میلانات کو اپنی خواہش کے تحت لے کے چلنا چاہتا ہے، اور چونکہ وہ اس سمت نہیں چلتے، لہٰذا ان کو کسی دوسری طرف بڑھنے سے روک رکھنا چاہتا ہے اسے بڑی غلط فہمی ہے کہ کبھی یہ اس کیفیت کو کسی فرد کی شرارت قرار دیتا ہے، کبھی سمجھتا ہے کہ یہ چند ملاؤں کا فتنہ ہے اور کبھی رائے قائم کرتا ہے کہ یہ فلاں دینی تنظیم کا اٹھایا ہوا طوفانِ فساد ہے۔ حالانکہ ایسے موثر تاریخی عوامل جب کام کرنے لگتے ہیں تو افراد اور تنظیموں کا پارٹ بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ان عوامل کے لیے ظاہری ذریعۂ اظہار اور وسیلۂ کار بنتے ہیں۔ اس غلط جائزہ کی وجہ سے وہ عجیب و غریب تضاد اور وہ دلچسپ کشمکش نمودار ہوئی ہے جس میں ایک طرف ہماری ہزار سالہ تاریخ فریق بنی کام کررہی ہے اور دوسری طرف ایک مختصر سا طبقہ اس کے سامنے مدافعانہ پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی تضاد (HISTORICAL CONBLICT) جو اصل عظیم مسئلہ ہے اور فوری طور پر قابلِ حل مسئلہ ہے۔ یہ وہ توجہ طلب صورتِ واقعہ ہے جس پر ہمارے اونچے دماغوں کو فکر و کاوش کی ساری توانیں صرف کردینی چاہئیں۔ مصر میں اخوان کو پھانسی چڑھا دینے اور پاکستان میں جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے سے یہ گرہ بہرحال نہیں سلجھ سکتی۔ کسی کے پاس کوئی ایسا آمرانہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس تاریخی تضاد و کشمکش کو تختہ دار پر لٹکا سکے اور کسی کے ہاتھ میں کوئی ایسی پاور نہیں ہے کہ اس عظیم مسئلے کو خلافِ قانون قرار دے سکے۔ ہم سلہری صاحب سے بھی اور دوسرے تمام سوچنے سمجھنے والے

حضرات سے بھی درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصل گتھی کو سلجھائیے۔

دو حل | یہ لاینحل نہیں ہے، بس صرف توجہ کی دیر ہے اگر ہمارے ذہین لوگ کشمکش کے سطحی مظاہر سے نیچے اتر کر اصل وجہِ کشمکش سے نجات پانے کی فکر کریں تو نہ کسی اخوان المسلمون سے پھر کوئی خطرہ رہ جاتا ہے، نہ کسی جماعت اسلامی کے وجود پر اضطراب!

اس کا ایک حل یہ ہے کہ کسی تدبیر سے مسلمان قوم کو مسلمان ہونے کے احساس اور اسلامی زندگی کے شعور اور اس تک پہنچنے کی تمنا سے خالی کر دیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا اور کوئی خرخشہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ خصوصاً جب تک قرآن موجود ہے، جب تک حدیث اور سنت کا ریکارڈ محفوظ ہے، جب تک دورِ سعادت کی تاریخ قوم کے حافظے پر ثبت ہے، جب تک اسلام کی روایات اور قدریں ہمارے لٹریچر، ہماری صحافت اور ہماری خطابت میں رچی بسی ہیں یہ قطعاً ناممکن ہے! اسے اگر سطحی نظر کے ساتھ آپ ممکن تصور کریں اور جبر و قوت سے قومی مزاج بدلنے کی کوشش شروع کر دیں تو ایک تو مسلمان قوم کے اپنے ہی خون سے آپ کو ہاتھ رنگنے ہوں گے، اسلامی رجحانات کو نہایت سخت گیرانہ طریق سے مسلسل دبانا ہو گا، اور چونکہ یہ بالکل مر نہیں سکتے اس لیے ہمیشہ ان کے درپے رہنا ہو گا، اپنی قوم سے معاملات کو سالہا سال کے لیے بگاڑنا ہو گا اور اس طرح کی لمبی کشمکش میں عمریں گذارنے کے لیے جمہوری فضا کو ختم کرنا ہو گا۔

اب سوچیئے کہ اس مہلک اور تباہ کن حل کو اختیار کرنے کے دور رس نتائج کیا نکلیں گے؟ ملکی حالات مصر و ایران کے معیار پر جا گریں گے اور بین الاقوامی لحاظ سے قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ قوم کے ولولے بجھ کے رہ جائیں گے اور اس کی طاقتوں کو کسی بڑی تعمیری مہم میں استعمال نہ کیا جا سکے گا۔ آگے چل کے جب مزید ردِ عمل پیدا ہوں گے تو کمیونزم جیسے فتنوں کو آئیڈیالوجی کے خلار کی وجہ سے حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت بچاؤ کرنے والی کوئی فکری طاقت موجود نہ ہو گی۔ علاوہ بریں بین الاقوامی توڑ پھوڑ کے ہنگامے میں اگر خدانخواستہ کوئی بڑا حادثہ قوم کو پیش آ گیا تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی مؤثر ذہنی و اخلاقی سامانِ دفاع بہم نہ پہنچ سکے گا۔ بیسیوں سال اسی حالتِ تعطل میں گذر جائیں گے اور قوم پستی سے نہ نکل سکے گی۔ لیکن بیسیوں سال کے بعد بھی جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ "اسلامی رجحان" اب تک بھی مرا نہیں ہے بلکہ وہ خطرہ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ جیسے کہ ترکیہ میں تیس تیس سال کا عرصہ اسلامی رجحان کے خلاف حکمراں طاقت نے معرکہ آرائی میں صرف کر دیا اور آج بھی وہاں حال یہ ہے کہ یہ رجحان بدستور کام کر رہا ہے اور اسے کچلنے کے لیے برابر قوم کا سرمایۂ قوت برباد کیا

جاتا رہتا ہے۔ ذرا اگر جمہوریت کی فضا پیدا ہو جائے تو فوراً یہ ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر جائے گا۔ سوچیے کہ قومی قوتوں کو اس بے جا کشمکش میں جھونکتے رہنے کا حاصل کیا ہوا؟

دوسرا حل یہ ہے کہ حکمراں طبقہ ذرا سی لچک اپنے اندر پیدا کر لے اور نظریاتی ضد چھوڑ دے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کر لے کہ قوم میں اسلامی نظامِ زندگی کے لیے عوامی تقاضا کارفرما ہے۔ وہ اس تقاضے کو لوحِ تاریخ پر باریک نظر سے پڑھے اور اسے قبول کر لے۔ بس فکر و نظر کی ذرا سی یہ تبدیلی اور ضدم ضدا کے جذبات کی معمولی سی یہ قربانی صورتِ حالات کا پورا نقشہ بدل کے رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا حل ہے کہ جو تاریخی تضاد و کشمکش کا خاتمہ کر کے ملت کی تمام طاقتوں کو ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس حل کو اختیار کرنے سے قوم کو آئیڈیالوجی کی قوتِ محرکہ مل جاتی ہے، اسے ایک بنائے اتحاد ہاتھ آتی ہے، اسے ترقی کرنے کے لیے ایک رہنما قوت بہم پہنچ جاتی ہے، اور وہ دنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اس حل کو قبول کر لینے سے ہمیں وہ ہتھیار مل جاتا ہے جس سے کمیونزم اور دوسرے باطل نظریات کے حملوں کو روکا جا سکے[1]۔ اس صورت میں ہم ایک ایسی طاقت سے مالا مال ہو جاتے ہیں جو ہمیں بین الاقوامی حادثات کے طوفان میں چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

ہم سلہری صاحب اور اپنے اکابر اور اس طبقے کے تمام ذہین لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس حل پر غور کریں۔ آخر کیوں یہ بات بالکل ناممکن قرار دے دی گئی ہے کہ ملت پر اثرانداز ہونے والے تاریخی تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا اور کیوں یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں کا خون بہا کر ہی آگے چلا جا سکتا ہے۔ جو ناکام اور احمقانہ حل ناصری آمریت[2] نے اختیار کیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے اکابر بھی اسی کو قابلِ تقلید مثال بنائیں؟

---

[1] چنانچہ زیرِ تدوین دستور سے لوگوں کو یہی امیدیں تھیں کہ اس کے نفاذ سے ہم مذکورہ بالا تاریخی تضاد و کشمکش سے نجات پا کر ایک متحدہ طاقت کی حیثیت سے کام کر سکیں گے۔

[2] غور فرمائیے کہ بنو امیہ کے عہد سے لے کر آج تک ذرا سی راج ہٹ کے لیے امت کے بہترین عناصر کا کتنا خون بہایا گیا ہے اور اس دور میں بھی ترکیہ اور مصر میں ملتِ اسلامیہ کی جس فعّال طاقت کو دریا برد کیا گیا اور کیا جا رہا ہے، پھر خود پاکستان میں بھی عدمِ تعاون ہی نہیں تشدد کر کر کے دینی طاقتوں کو جتنا کمزور کیا جا رہا ہے، اگر اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کی مہم اس طرح جاری نہ رکھی جاتی تو ہماری قوتِ تعمیر کتنی بڑی ہوتی اور ہم اپنے موجودہ مقام سے کتنے آگے ہوتے۔

کوئی نہیں کہتا کہ جدید حالات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چلیئے، کسی میں یہ انتہا پسندی کارفرما نہیں ہے کہ پورے کا پورا اسلام آناً فاناً یہاں سے وہاں تک چھا جائے، بلکہ سب لوگ تدریج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہی تن تنہا سب کچھ (ALL IN ALL) ہو، کسی کو موجودہ حکمرانوں سے کوئی چڑ اور کد نہیں ہے کہ ان کو ضرور ان کے مناصب سے ہٹانا ہے اور اسلام کا نام اسی کد کو پورا کرنے کے لیے نقابِ فریب کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ آپ لوگ دوسروں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور قومی عناصر اور طاقتوں کو باہم دگر پھاڑیئے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ان کو قریب تر کرنے کی فکر کیجئے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلام کو کسی درجے میں اپنایئے اور خلوص سے اپنایئے اور پھر تھوڑا یا بہت عملی کام کر کے دکھایئے۔ جس دن آپ نے تبدیلی کا ثبوت ہمارے اکابر نے دے دیا اُس دن بالکل نئے جذبات اور نئے حالات کے سرچشمے پھوٹ پڑیں گے۔ جو شخص اس صف میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر یہ تجربہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ اس کے کتنے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں اور کتنی بڑی قبولیتِ عامہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ سلہری صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اوپر کی بحث سے اگر کوئی ناگوار اثر بھی لیں تو اسے اس موقع پر ذہن سے الگ کر کے ان نقاطِ فکر کے مطابق بھی ذرا غور فرمائیں۔ پہلے حل اور دوسرے حل کے نتائج کے فرق کا جائزہ لیں۔ پھر اپنے ہی سامنے یہ سوال رکھیں کہ کیا یہ دوسری صورت بالکل ناممکن ہے؟

الاخوان المسلمون اور مصر کی فوجی حکومت

یہ مضمون بیروت (شام) سے شائع ہونے والے ایک عربی روزنامہ "الھدف" مورخہ ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ میں چھپا ہے۔ ابتداءً "ترجمان القرآن" میں شائع کرنے کی غرض سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا، لیکن "ترجمان" کی طباعت سے قبل معلومات کی اہمیت کے پیش نظر اسے روزنامہ "تسنیم" کے "اخوان نمبر" میں بھی نقل کردیا گیا تھا۔ قارئین ترجمان کے خاص حلقے کے لیے امید ہے کہ اس کی دوبارہ اشاعت بے سود نہیں ہوگی۔

مصر کی فوجی حکومت کا الزام مصر کے موجودہ فوجی حکمران اس بات کے مدعی ہیں کہ "الاخوان المسلمون" کا رویہ فوجی انقلاب کے بارے میں ہمیشہ سے منفیانہ اور معاندانہ رہا ہے۔ انہوں نے انقلابی تحریک کی شروع ہی سے مخالفت کی ہے، اُسے ناکام بنانا چاہا ہے اور اس کے خلاف مسلسل پراپگنڈا کیا ہے۔ انہوں نے فوج اور پولیس کے اندر باقاعدہ تنظیمیں قائم کی ہیں اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ایک ملک گیر سازش تیار کی ہے۔ اس کے بعد اخوان کے قائدین نے انگریزوں سے خفیہ گٹھ جوڑ کی ہے اور اُن سے مل کر فوجی حکومت کے خلاف منصوبہ بنایا ہے۔ اس پر حکومت نے اخوان کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں دوبارہ کام کرنے کا موقع دیا گیا لیکن وہ اپنی سابق روش اور جوڑ توڑ سے باز نہ آئے حتیٰ کہ انہوں نے وزیر اعظم جمال عبدالناصر کے قتل کے لیے سازش کی۔ ان حالات میں یہ امر ناگزیر تھا کہ اخوان کا خاتمہ کردیا جائے اور مصر کو رجعت پسند اور تخریبی عناصر سے پاک کردیا جائے۔

اخوان کا جواب اس کے بالمقابل اخوان کا بیان یہ ہے کہ فوجی انقلاب کے علمبرداروں اور الاخوان المسلمون کے مابین ابتدائی فضا تعاون و اشتراک کی تھی۔ شروع میں انقلابیوں نے جو اقدامات بھی کئے ہیں وہ فوج اور پولیس کے ان افسران کے بل پر کئے ہیں جو اخوان سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قدم پر اخوان نے حکمرانوں کے حق میں قوم کی رائے کو ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ اربابِ اقتدار کے ساتھ اخوان کے روابط موجودہ انقلاب سے بہت قبل ۱۹۴۵ء سے قائم ہیں۔ اخوان کے جو حلقے اُس وقت فوج میں موجود تھے ان کے اجتماعات میں جمال عبدالناصر، عبداللطیف بغدادی

کمال الدین حسین، حسن ابراہیم، خالد محی الدین، حسین شافعی وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب جماعت اخوان کو توڑ دیا گیا تو اُس وقت جمال عبدالناصر اور ان کے ساتھیوں نے آزادی پسند فوجی افسروں کی ایک الگ تنظیم بنائی لیکن اخوان کے ساتھ ان کے مراسم بہت اچھے رہے حتیٰ کہ جس وقت فاروق کے خلاف مسلح انقلاب کا پروگرام بنایا جا رہا تھا اُس وقت یہ افسر اور اخوان مِل جُل کر کام کر رہے تھے۔ عین اُس وقت جب کہ قاہرہ پر قبضہ کر لینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں فاروق کو کچھ شبہ لاحق ہو گیا۔ اور اُس نے اسلحہ کی تلاشی کے لیے احکام جاری کر دئے۔ فوجی افسروں نے اس موقع پر اخوان سے مدد چاہی تاکہ افسران کی رہائش گاہوں میں جمع شدہ ہتھیاروں کو کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچایا جائے۔ اس وقت قاہرہ کی حالت یہ تھی کہ چاروں طرف فاروق کے حامی سپاہی پھیلے ہوئے تھے، اکثر مقامات پر گولی چل رہی تھی، سڑکوں پر ہتھیار اور اسلحہ کا ذخیرہ لے کر نقل و حرکت کرنا تو کجا، نہتّے آدمی کا چلنا پھرنا بھی موت کے منہ میں جانے کے ہم معنی تھا۔ اس آگ اور خون کی بارش میں اخوان اپنی گاڑیاں لے کر فوجی حکام کے گھروں تک پہنچے اور وہاں سے سامانِ جنگ لاد لاد کر حسن عشماوی (خلف الاستاذ محمد حسن عشماوی پاشا) کے ہاں جمع کرتے رہے۔ جمال عبدالناصر کی اپنی ہدایات اور نگرانی کے تحت یہ ذخیرہ عشماوی صاحب کی زمین کے ایک دور افتادہ حصے میں چھپا دیا گیا تھا۔ گذشتہ جنوری میں جب اخوان کو خلاف قانون قرار دے کر اُن کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا تو اسلحہ کا یہی ذخیرہ تھا جسے ڈرامائی انداز میں چھاپہ مار کر برآمد کیا گیا تھا، ساتھ ہی حسن عشماوی صاحب کو بھی بے گناہ پکڑ کر فوجی جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا اور اُن کے خلاف یہ جھوٹا الزام بھی عائد کر دیا گیا کہ وہ نظام حکومت کو الٹنے کے لیے اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ احسان شناسی کا یہ ایک عجیب و غریب اور انوکھا طریقہ ہے جسے موجودہ فوجی انقلاب پرستوں نے ایجاد کیا ہے! موجودہ برسرِاقتدار گروہ کے حسن سلوک کی یہ واحد مثال نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس کسی نے بھی خاموشی اور اخلاص کے ساتھ ان سے تعاون کیا ہے اس کا حشر ایسا ہی ہوا ہے۔ مثلاً کرنل رشاد مہنا کو (جو ملٹری کالج کے استاذ تھے) حبسِ دوام کی سزا دے دی گئی ہے اور وہ اس وقت فوجی قید خانے کی تاریک اور سنگین کوٹھڑی میں بند ہیں۔ کرنل یوسف جو ہتھیار اٹھا کر لڑنے والوں کی صف اوّل میں شریک تھے اور احمد شوقی جنہوں نے ریڈیو اسٹیشن کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا دونوں ملٹری جیل کے مکین ہیں۔ کرنل خالد محی الدین سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔ اسی طرح بے شمار حریت پسند فوجی افسر ایسے ہیں جنہیں یا تو علیحدہ کر دیا گیا ہے یا گرفتار کر لیا گیا ہے ایسے افسروں کی گنتی ہزار سے

ذرائع تک پہنچی ہے۔

اخوان کا حکومت سے تعاون اخوان کا یہ کہنا ہے کہ ان ابتدائی نازک مراحل میں الاخوان المسلمون اور فوج کے حکام کا تعاون اتنا زیادہ تھا کہ مصر اور بیرون مصر میں عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ مصر میں یہ انقلاب اخوان نے ہی برپا کیا ہے۔ حالانکہ اخوان کی خواہش شروع سے یہ تھی کہ اس جدوجہد میں جو حصہ انہوں نے ادا کیا ہے اُس کی روداد منظرِ عام پر نہ آئے تاکہ دنیا بھر کی وہ طاقتیں اور سلطنتیں جنہیں اخوان اور اسلام کے خلاف دلی بغض و عناد ہے اس نوخیز انقلاب کی راہ روکنے پر کمربستہ نہ ہوجائیں۔ بہرکیف یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مصر کی اس تحریک آزادی میں اخوان کی کوششوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ایک طرف تو فوج اور پولیس میں اخوان کے آدمی انقلاب کا راستہ ہموار کر رہے تھے، اور دوسری طرف شہری آبادیوں میں ہزارہا اخوان سڑکوں اور بازاروں میں پہرہ دار بن کر کھڑے ہوگئے تاکہ وہ غیر ملکی اداروں، سفارت خانوں اور شہروں کے ان حصّوں کی حفاظت کریں، جہاں اجنبی اقوام کے شہری بستے ہیں۔ وہ عوام کے اندر پُرامن انقلاب کے لیے داعی بن کر نکل آئے تاکہ شہروں اور دیہات میں امن کو بھی بحال رکھ سکیں اور لوگوں کو اس تحریک کا حامی بھی بنائیں۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اخوان اس جنگ آزادی کا دل و دماغ دست و بازو اور روح رواں تھے اور انتہائی خطرناک مراحل میں اس جنگ کے لیے فکری تائید اور قومی بنیاد اخوان نے ہی فراہم کی ہے۔ فاروق نے اپنے خود نوشت سوانح حیات میں اس امر کی پوری صفائی اور وضاحت کردی ہے کہ فوجی انقلاب اس کے خائف ہوجانے اور اُس کے سامنے سپر ڈال دینے کی اوّلین اور بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس کی پشت پر اخوان کی طاقت موجود تھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک مجرّد فوجیوں کی شورش نہیں تھی جس کا دبالینا آسان ہوتا، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر قومی جہاد تھا جس کا مقابلہ بڑا دشوار تھا۔ جنرل محمد نجیب نے شروع میں جب مصر کا دورہ شروع کیا تھا، اُس وقت اخوان نے ہر مقام پر عظیم اجتماعات کی شکل میں اُن کا استقبال کیا، چنانچہ جب وہ قاہرہ واپس آئے تو انہوں نے اخوان کا شکریہ ادا کیا اور علانیہ اخوان کی تعریف و توصیف کی۔ جمال عبدالناصر جب قاہرہ یونیورسٹی کا معائنہ کرنے آئے تھے تو وہاں کچھ لوگوں نے انقلابیوں اور اینگلو امریکی ایجنٹوں کے خلاف نعرے لگانے کا خفیہ پروگرام بنایا تھا۔ لیکن اخوان کو چونکہ یونیورسٹی کے طلبا میں پچاسی فیصد سے بھی زیادہ کی حمایت حاصل ہے اس لیے انہوں نے اس پروگرام کو ناکام بنادیا تاکہ مصر کے دشمن یہ نہ خیال کریں کہ تعلیم یافتہ طبقہ انقلاب کے حق میں نہیں ہے۔

اخوان نے جن مختلف پیرایوں میں فوجی تحریک کی اعانت کی ہے، ان کی صرف چند مثالیں اوپر بیان ہوئی ہیں نصرت و تائید کی یہ صورتیں بالکل فطری تھیں۔ اس کے متعدد وجوہ تھے۔ ایک نوجوانوں کے ساتھ اخوان کے دیرینہ مراسم تھے دوسرے اخوان پہلے سے ہی فاروق کے خلاف معرکہ آرا تھے اور اس کے استبداد اور ظلم وستم کا نشانہ جس طریق پر اخوان بن رہے تھے، اس طرح کوئی اور فرد یا گروہ نہیں بن رہا تھا۔ اس سلسلے میں جن مظالم و شدائد، جن مصیبتوں اور اذیتوں میں اخوان کو مبتلا ہونا پڑا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ پھر فوجی انقلاب کے سربراہ کاروں نے اخوان کو یہ یقین دلایا تھا کہ ان کا اصل نصب العین اسلام کا غلبہ اور اسلام کی حکومت ہے جسے وہ تدریجاً حاصل کریں گے۔

اخوان نے ان کے وعدے کو تسلیم کیا۔ انقلاب کے وقوع کے ایک ماہ بعد مرشد عام شیخ الہضیبی نے محمد نجیب اور جمال عبدالناصر سے کہا تھا کہ "اگر آپ ابھی اسلام کا نام لیتے ہوئے ڈرتے ہیں تو کم از کم امکانی حد تک اس کے لیے کام تو کرنا شروع کردیں"۔ نرمی کی یہ آخری حد تھی جہاں تک اخوان جاسکتے تھے اور فوجی حکومت کے بالمقابل اخوان کا رویہ ہمیشہ اسی نہج پر رہا۔ مرشد عام جو تیس سال تک عدالت عالیہ کے جج اور ممتاز قانونی مشیر رہ چکے ہیں، ان کے بارے میں یہ خیال کرنا قطعاً غلط ہے کہ وہ قانونی حدود یا دستوری مقتضیات کا فہم نہیں رکھتے یا وہ دقت نظر اور وسعت فکر سے محروم ہیں۔

فوجی حکام کے غیر اسلامی اقدامات لیکن دین اور اسلام کی خدمت کے جو دعوے فوجی حکام نے کیے تھے، بہت جلد ان کی عملی خلاف ورزیوں کا آغاز کردیا گیا۔ ان خلاف ورزیوں کا مظاہرہ مختلف طریقوں سے کیا گیا۔ "فطار الرحمہ" کے نام سے تقریبات کا انعقاد شروع ہوا، ان میں ایکٹروں، بھانڈوں، گویوں اور رقاصاؤں کو شریک کیا گیا اور علانیہ بے حیائی، فحاشی اور بوس وکنار کا ارتکاب کیا گیا۔

اس کے علاوہ "مقابلہ حسن وجمال" کی ایسی مجالس گرم کی گئیں جیسی اس فاروق کے عہد میں بھی قائم نہ ہوئی تھیں جس کی عیاشی رسوائے روزگار ہے اور جس کی عیاشی ہی کی وجہ سے اخوان اور فاروق کے درمیان ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ بیرونی ممالک کے سیاحوں کے لیے "مرشدات" (رہنمائی کرنے والی لڑکیوں) کا ایک ایسا نظام قائم کیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر رمضان کے مبارک مہینے کی راتوں میں ایسے "تفریحی اجتماعات" منعقد کیے گئے جن میں شرمناک مشاغل سحری کے وقت بھی جاری رہتے تھے، حالانکہ فاروق بھی (از راہ نفاق ہی سہی) ان اوقات میں تلاوت قرآن کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ محکمہ امور عامہ کی طرف سے ان سارے پروگراموں کی سرپرستی کی گئی۔ ان سارے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اخوان اور فوجی

حکومت کے درمیان اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی کیونکہ ان دونوں کے درمیان اشتراک و اتحاد پیدا کرنے والی چیز فقط کلمۂ اسلام تھا۔ اس خلیج کا پاٹنا کسی فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اخوان اور فوجی افسران کے مابین تعاون کی فضا محض اصلاح کے وعدوں اور توقعات کی بنا پر قائم ہوئی تھی، اس سے مقصود تعاون علی الاثم اور ایسے منکرات میں ساتھ دینا نہیں تھا جن کی نظیر فاروق کے زمانے میں بھی نہیں ملتی۔

ھیئۃ التحریر کی تشکیل اس کے بعد موجودہ حکمرانوں نے "ھیئۃ التحریر" کے نام سے ایک نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالی اخوان نے انہیں نصیحت کی کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔ شیخ حسن الہضیبی نے ان سے کہا کہ "ایسا اقدام اُن کے مفاد اور قومی مصلحت کے خلاف ہوگا۔ ان کا تعلق یکساں طور پر پوری قوم سے ہونا چاہیے۔ ان کا ایک جماعت سے اپنے آپ کو منسوب و محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔ فوج اور پولیس کے یہ بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ پارٹیوں کی تاسیس و تشکیل کریں۔ اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مفاد پرست اور ابن الوقت قسم کے لوگ اس پارٹی پر چھا جائیں گے اور اس کے نام پر ناجائز فائدے حاصل کریں گے اور یہ امر حکومت اور انقلابی تحریک کے لیے نقصان اور بدنامی کا موجب ہوگا"۔ یہ رائے فقط اخوان ہی کی نہیں تھی خود جنرل محمد نجیب نے انقلابی مجلس کے ایک اجلاس میں اسی طرح کا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا "میری یہ رائے ہے کہ جماعت اخوان ہی کو انقلابی تحریک کی بنیاد بنایا جائے۔ ان میں اخلاص کی قوت اور عقیدے کی طاقت ہے، وہ دنیائے عرب کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ایک نہایت مضبوط اور وسیع تنظیم کے حامل ہیں۔ البتہ ہمیں اُن کی صرف غیر رسمی اور اخلاقی تائید پر قناعت کرنی چاہیے تاکہ ایک طرف ہمیں ان کا تعاون بھی حاصل رہے اور دوسری طرف مغربی اقوام کے سامنے ہم پر اخوان کی اُس دعوت کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو جس کے خلاف یہ قومیں انتہائی خوف اور عناد کے جذبات رکھتی ہیں"۔ جنرل نجیب نے اپنے بہت سے قریبی دوستوں سے یہ کہا تھا کہ "بعض عناصر "ھیئۃ التحریر" کا ناجائز استعمال کریں گے، اور اس کے نتیجے میں ہمارے تعلقات اخوان سے بگڑ جائیں گے، کیونکہ وہ بیس سال سے ایک واضح اور متعین دعوت کے علمبردار ہیں۔ اور اس راستے میں انہیں عظیم آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ نہ تو ہم اخوان کو اپنے موقف سے منحرف کر سکتے ہیں اور نہ ہم چند دنوں یا چند مہینوں میں کسی ایسی قومی تحریک کو جنم دے سکتے ہیں جو انقلاب کے تقاضوں کے شایان شان ہو اور جو اخوان کی تنظیم کی مد مقابل قرار پا سکے"۔

بجائے اس کے کہ انقلابی کونسل کے ارکان کی طرف سے اس مخلصانہ مشورہ کا خیر مقدم کیا جاتا، اس کے نتیجے میں

اخوان اور کونسل کے مابین بُعد اور زیادہ ہوگیا، بلکہ انقلابیوں نے اخوان کے ارکان کو ھیئۃ التحریر میں جبراً شامل کرنے کی ناکام کوششیں بھی کیں۔ قدرتی طور پر اخوان نے نوجیوں سے اپنی برأت کا اظہار کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خدا خلق کے سامنے ایک ایسی پارٹی کے اعمال کی ذمہ داری قبول کریں جو نہ ان کے نظریات کی پابند تھی اور نہ اُن کے مشورے قبول کرتی تھی تاہم اخوان چونکہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم کسی داخلی انتشار میں مبتلا ہو اس لیے مرشد عام نے انقلاب پسندوں کے نام یہ پیغام بھجوایا کہ "ھیئۃ التحریر" کے پہلو بہ پہلو اخوان کی تنظیم کے موجود ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی مخاصمت ہے یا اخوان اُن کے حریف ہیں۔ اخوان ایک قدیمی تحریک اور دائمی دعوت کے داعی ہیں، تاہم وہ اس کے لیے آمادہ ہیں کہ اگر ہیئت کوئی نافع پروگرام وضع کرے تو اخوان اس کا ساتھ دیں"۔ اخوان نے اپنے وعدے کی صداقت کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ جب نیشنل گارڈز کی عسکری تنظیم شروع کی گئی تو اس کی اکثریت اخوان کے نوجوان پر ہی مشتمل تھی۔

ظلم و تشدد کا آغاز اس کے بعد جمال عبدالناصر نے مرشد عام سے اس امر کی ضمانت اور صراحت طلب کی کہ اخوان کے نوجی اور پولیس کے صفوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ مرشد عام نے جواب دیا کہ "آپ یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں، مگر ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس بات کی ضمانت دیں کہ فوج اور پولیس کے اندر اسلامی اسپرٹ اور اخلاقی اقدار کے برقرار رکھنے کا اطمینان بخش طریق پر انتظام کیا جائے گا"۔ لیکن جمال عبدالناصر نے اس پر جو فوری قدم اٹھایا وہ یہ کہ اُن تمام افسران کو دور دراز مقامات پر بھیجنا شروع کر دیا جن کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ اخوان سے تعلق رکھتے ہیں یا دینداری اور صلاح و تقویٰ کے لحاظ سے معروف ہیں۔ بہت سے افسروں کو معزول کر دیا گیا اور جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ بالکل اسی قسم کی کارروائیاں پولیس میں بھی کی گئیں پھر ملٹری اور پولیس کے کالجوں کو احکامات دیئے گئے کہ وہ کسی ایسے طالب علم کو داخل نہ کریں جس کے بارے میں یہ شبہ بھی ہو کہ وہ اخوان کا ہم خیال ہے۔ بلکہ اس کے بعد تمام مدارس ثانویہ کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وہ سی، آئی، ڈی اور فوج کو ایسے طلباء کے بارے میں معلومات دیں جن کے بارے میں اخوان سے ہمدردی کا گمان کیا جا سکتا ہو۔ ان ناموں پر مشتمل بلیک لسٹیں تیار کی گئیں تاکہ وہ ملٹری کالج اور پولیس کالج کے ارباب کو مہیا کی جائیں اور انہیں ہدایت کی جائے کہ وہ ان نوجوانوں کو کالجوں میں نہ لیں۔ اخوان یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے اور سنتے رہے لیکن انہوں نے اس کے خلاف کوئی زبانی یا عملی احتجاج نہ کیا مبادا کہ مصر میں امن و سلامتی خطرے میں پڑ جائے۔ اس کے بعد سول آفیسرز کے معاملے میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا گیا اور لاتعداد

افسران کو دور دراز علاقوں اور دیہات میں تبدیل کیا جانے لگا۔ اخوان نے اس پر بھی صبر و سکوت کے دامن کو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

انگریزوں سے گفت و شنید اس کے بعد انقلابی کونسل اور برطانیہ کے مابین گفت و شنید کا مرحلہ درپیش آیا۔ اسی دوران میں برطانوی سفارت خانے کے مشیر مسٹر ایونز نے الاستاذ الھضیبی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ایک مشن کے حامل اور ایک جماعت کے قائد کی حیثیت سے مرشد عام کو پورا حق پہنچتا ہے بلکہ اُن پر واجب ہے کہ وہ ہر انسان کے سامنے اپنا نظریہ اور نکتۂ نظر پیش کریں خصوصاً جب کہ وہ خود اس کا طالب ہو۔ تاہم مرشد عام نے اس دعوت نامے کو قبول کرنے سے پہلے کونسل کے ارکان کو اس سے آگاہ کر دیا اور اُن سے اس بارے میں رائے بھی طلب کی۔ پھر اس ملاقات کے فوراً بعد مرشد عام نے انقلابی کونسل کو اس کی پوری روداد سے بھی باخبر کر دیا۔ شیخ الھضیبی نے بتایا کہ انہوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ نہر سویز کا انخلاء کلّی اور غیر مشروط طور پر ضروری ہے۔ اور آئندہ کسی عالمگیر جنگ کے موقع پر مصر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ وہ خود بھی بالکل آزاد اور غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے اور پورے عالم عرب اور عالم اسلام کو بھی اسی حیثیت میں دیکھنے کا متمنّی ہے۔ اُس وقت کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ملاقات اور ان مذاکرات کو کچھ عرصہ بعد بالکل غلط اور اُلٹے رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا، اسے بہانہ بنا کر اخوان کے قائد اور سینکڑوں ارکان کو فوجی زندان خانوں میں ڈال دیا جائے گا اور ڈھائی ماہ تک بغیر تحقیق و مقدمہ کے قید تنہائی میں مبتلا رکھا جائے گا۔ دنیا پر اب یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو چکی ہے کہ مصری قوم اور مصری ریاست کے مفاد کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کرنے والے آیا اخوان تھے یا کوئی اور تھا۔

اس موقعہ پر جنرل نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر میں اختلاف پیدا ہو گیا، مصر کے امن عامہ میں خلل رونما ہو گیا، اور ملک سعود نے فوجی حکومت سے سفارش کی کہ وہ اخوان کے جملہ اسیران کو رہا کر کے انہیں جماعتی سرگرمیاں بحال کرنے کی غیر مشروط اجازت دے۔ فوجی حکومت نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا لیکن یہ وعدہ شرمندۂ تعمیل نہ ہو سکا۔ مرشد عام اور چند ارکان کو تو رہا کیا گیا لیکن نہ تو اخوان کو خلاف قانون قرار دیئے جانے کا حکم واپس لیا گیا اور نہ اخوان کے فوجی افسروں کو آزاد کیا گیا، بلکہ اخوان کی صفوں میں تفریق پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح حسن الھضیبی سے نجات حاصل کی جائے۔ اور اخوان کو ان سے بدظن کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے خیال میں وحدتِ اخوان اور ان کی ایک مستقل جماعتی اور سیاسی پالیسی کا اصل

انحصار ھضیبی کی ذات پر تھا۔ حکومت کی اسی روش کا نتیجہ تھا کہ مصر کے اخبارات میں مرشد اور ارکان کے مبینہ اختلافات سے متعلق متعدد من گھڑت افسانے اور فرضی قصے شائع ہوتے رہے۔

معاہدۂ سویز اور اخوان کا موقف برطانیہ سے گفت وشنید کے بعد اب اُن سے باقاعدہ معاہدہ طے کیے جانے کا وقت آپہنچا۔ اس موقع پر پھر ایک مرتبہ اخوان کو ظلم وستم اور جبر و تشدد کے ذریعے کچلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گذشتہ موقع پر ان پر بہتان یہ تھا کہ وہ انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں، اب کی مرتبہ الزام یہ تراشا گیا کہ وہ حکومت اور انگریزوں کے مابین مجوزہ معاہدۂ سوئز کے خلاف زبان کھول رہے ہیں۔ اخوان کے لیے آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسے معاہدے کے موقع پر خاموش رہتے جس میں ایک طرف نہر سوئز کا نمائشی تخلیہ تجویز کیا جارہا ہو۔ اور دوسری طرف ایسی شرائط طے کی جارہی ہوں جن میں مصری حقوق کی صریح پامالی صاف نظر آرہی ہو، مشترک دفاع کے نام سے مصر کو جنگ کے خونخوار دیوتا کی گاڑی میں زبردستی جوتا جارہا ہو اور پھر مصر کے ذریعے سے دوسرے تمام اسلامی ممالک کو بھی اسی خونین لپیٹ میں لیا جارہا ہو۔ صورت حالات کی اس نزاکت اور سنگینی کے باوجود اخوان نے جو صدا بلند کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ مرشد عام سے جب دمشق کے دورے میں معاہدے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے مختصراً اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کردیا اور اخوان کے ایک وفد نے اس معاہدے کے بارے میں جمال عبدالناصر سے ملنا چاہا، لیکن جب اس کی اجازت نہ ملی تو اخوان کی مجلس عاملہ نے اس بارے میں غور و فکر کے بعد اپنی رائے ایک باقاعدہ مدلل قرارداد کی شکل میں جمال عبدالناصر کے نام ارسال کردی۔ اخوان نے اس کے ساتھ اپنی قرارداد کے پریس میں شائع کرنے کی اجازت طلب کی، لیکن محکمہ سنسر نے انکار کردیا۔ اس پر اخوان نے اس قرارداد کو ایک منشور کی شکل میں طبع کرا کر ایک ہی دن میں پورے مصر میں پھیلا دیا۔ انقلابی مجلس کی نظر میں اخوان کا یہ عظیم ترین جرم تھا جس پر انہیں باغی، خائن، رجعت پسند اور تخریب انگیز اور نہ جانے کیسے کیسے خطابات سے نوازا گیا اور حکومت کے ترجمان "الجمہوریہ" نے اخوان کے خلاف مسلسل کئی ہفتوں تک لعن طعن اور پراپیگنڈے کی مہم کو جاری رکھا۔ حالانکہ انقلابی کونسل کو اس بات کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اخوان یا کسی دوسرے فرد یا جماعت کو اس معاہدۂ سوئز یا مصر کے کسی دوسرے قومی معاملے میں اظہار خیال سے روکے۔ سرزمین مصر کسی خاص شخصیت یا جماعت کی ملکیت نہیں ہے۔ اخوان کی سابقہ تاریخ کے ابواب اُس عظیم الشان جہاد کی داستانوں سے بھرپور ہیں، جو انھوں نے نہر سویز میں انگریزوں کے خلاف سرانجام دیا ہے۔

آخری خونریز معرکے کے پر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور سوئز کی سرزمین پر سے عادل غانم، عمر شاہین، احمد المنیسی اور اخوان کے

دوسرے نوجوان طلبہ کا پاکیزہ اور گرم خون ابھی تک خشک نہیں ہوا۔ ان تمام شہداء نے اپنی قیمتی اور عزیز جانیں اسی لیے نثار کی ہیں کہ مصر کو دین اور وطن کے دشمنوں سے پاک کیا جائے۔ اخوان سے آخر کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس معاملے میں لب کشائی نہ کریں گے جو مصر اور اسلام کی موت و حیات کا معاملہ ہے۔ کیا فوجی حکمران یہ چاہتے تھے کہ اخوان کو جب جیلوں سے نکالا گیا تو اس رہائی کی قیمت وہ اس شکل میں ادا کرتے کہ حکومت کے ہر فعل پر آمنّا و صدّقنا کہتے یا مہر بلب رہتے، حتیٰ کہ حکمران اگر دین و وطن کے دیرینہ دشمنوں سے سمجھوتہ بھی کرلیں تو اس پر اُف تک نہ کرتے؟

عہد شکنیاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کس نے اپنے عہد کو توڑا ہے اور اپنے ماضی کو فراموش کیا ہے۔ مصری اخبارات ریڈیو، پبلک پلیٹ فارم تمام اس بات کے گواہ ہیں کہ شروع میں انقلابیوں نے اعلان کیا تھا کہ "ہم انگریز کتوں کے خلاف لڑیں گے اور ان ملعونوں کو سوئز سے نکال باہر کریں گے۔ ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور وہ مسلح مقابلے کا ہے۔ انقلابی مجلس کے ارکان سب سے آگے بڑھ کر استعمار پرستوں پر ہلہ بولیں گے۔ گفت و شنید اور نامہ و پیام ہمارے مقصد کے حصول کا ایک نہایت کمزور، بودا اور لاطائل ذریعہ ہے۔ مجلس کا حقیقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انگریزوں کو مار مار کر بھگا دے اور انہیں ایسا سبق دے جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں"۔ ان بلند بانگ دعووں کے ساتھ نیشنل گارڈز کی تنظیم شروع ہوئی اور تمام قوم نے اپنے آپ کو فوجی تربیت کے لیے پیش کیا۔ اخوانی نوجوان اس میں حصہ لینے کے لیے سب سے پیش پیش تھے لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد جمال عبدالناصر قوم کی تمناؤں اور ان کے دلوں سے اپنے آپ کو دور کرتا چلا گیا۔ اور عوام فوجی راج سے تنگ آ گئے۔ عبدالناصر نے نیشنل گارڈز میں اخوان کی شمولیت کو بھی شک و شبہ بلکہ خطرہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا اور فوجی منطق و نفسیات وزیراعظم کے ذہن پر غالب آگئیں اور سامراجی ایجنٹوں نے بھی اُسے بہکانا اور بھٹکانا شروع کر دیا چنانچہ کچھ مدت کے بعد احکامات جاری کئے گئے کہ نیشنل گارڈز میں صرف "ھیئۃ التحریر" کے ممبروں کو بھرتی کیا جائے کیونکہ وطن کی حفاظت کی واحد سبیل یہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخوان کو اس میدان سے خارج کر دیا گیا اور گارڈز کی تنظیم مرجھا کر رہ گئی اس کے بعد کیا ہوا؟ انقلابیوں نے برطانویوں سے گفت و شنید کا وہی رشتہ پھر ہاتھ میں تھام لیا جسے وہ چھوڑ چکے تھے اور مسلح مٹھ بھیڑ اور نیشنل گارڈز کے سارے دعوے اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اب یہ ارشاد کیا جانے لگا کہ "مسلح لڑائی کا خیال تہور بے جا بلکہ کم عقلی اور کوتاہ نظری کی پیداوار ہے۔ انگریزوں کی قوم دیانت و امانت کی دولت سے مالا مال ہے اور نہر سوئز میں مقیم فوجیں ہماری معزز مہمان ہیں"۔ رفتہ رفتہ ان معززین کے ساتھ مراسلات، مکالمات، مذاکرات

استقبال اور ضیافتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا جو انجام کار موجودہ معاہدے پر منتج ہوا۔

اخوان کا موقف یہ ہے کہ اگر مصر کے مفاد کی حفاظت مذاکرات و معاہدات کے ذریعے ممکن ہے اور اگر دشمن سے مفید اور نتیجہ خیز شرائط سیدھی طرح منوائی جا سکتی ہیں تو ایسا ضرور کیا جائے لیکن اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ابنائے قوم کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس حرکت کے لیے کونسی معقول وجہ موجود ہے کہ جو آدمی اس معاہدے کے بارے میں منہ کھولے یا کسی دوسرے کو کھولنے کا مشورہ دے اُسے فوراً پکڑ لیا جائے، اور کسی اخبار کو بھی اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اس موضوع پر تنقید کا ایک حرف بھی چھاپ سکے۔

دہشت پسند کون ہے؟ خوفناک دہشت و تشدد کی ایک مثال وہ ہے جو قاہرہ کی مسجد روضہ میں پیش آئی۔ یہ وہ مسجد ہے جسے اخوان نے تعمیر کیا تھا۔ اس مسجد میں اوّل روز سے اخوان کے خطباء ہر قسم کے دینی، اجتماعی اور قومی موضوعات پر اپنے خیالات پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ تعلیماتِ اسلام کی بنا پر اخوان اس امر کے قائل ہیں کہ مسجدیں مسلمانوں کا ایک ایسا پلیٹ فارم اور جائے اجتماع ہیں جہاں ان کے سارے دینی و دنیوی معاملات پر اظہار خیال اور بحث و تمحیص ہونا لازم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ سنّت تھی کہ جب مسلمانوں کو اجتماعی طور پر کوئی اہم اور نازک مسئلہ درپیش ہوتا تو ایک منادی بستی میں ندائے عام بلند کر کے کہتا تھا کہ "الصّلوٰۃ جامعۃ" اس کے بعد سارے مسلمان مسجد میں جمع ہو جاتے تھے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی معیت میں اپنے اجتماعی، سیاسی اور عسکری معاملات پر غور و خوض کریں۔ چنانچہ اخوان المسلمون کے داعیوں کا بھی پچیس برس سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ مختلف مسائل پر مساجد میں خطبات دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ مسجد روضہ میں بھی اخوان کے دیرینہ خطیب حسن دوح وکیل ایک مجمع میں حسب معمول کھڑے ہوئے تاکہ وہ موجودہ انقلاب پر تبصرہ کریں۔ پہلے انھوں نے اس کے مفید نتائج اور خیر کے پہلو بیان کیے۔ ان کو بروئے کار لانے والوں کا شکریہ ادا کیا اور دعا کی، کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید خیر کی توفیق دے۔ بعد میں انھوں نے موجودہ معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس بارے میں قوم کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے حکومت اور قوم کے حق میں بہتر یہی ہے کہ لوگوں کو آزادانہ اظہار رائے کی پوری اجازت دی جائے۔ آزادیٔ رائے کی مناسب حوصلہ افزائی کرنا اس کو دبا دینے کی بہ نسبت زیادہ مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ جونہی نماز ختم ہوئی پولیس کا ایک دستہ جوتوں سمیت مسجد میں گھس آیا اور انہوں نے نمازیوں کو بندوقوں کے کندوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ گولیاں برسانا شروع کر دیں اور بہت سے مسلمانوں کو زخمی کر دیا گیا۔ استاذ دوح اور ان کے ساتھ چھبیس آدمیوں کو

گھیر لیا گیا، ان کے کپڑے پھاڑ دیے گئے اور انہیں کشاں کشاں جیل میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ مسجد میں مجروح ہونے والے بہت سے معصوم بچے بھی تھے جو والدین اور اعزہ کے ساتھ نماز ادا کرنے گئے تھے۔

یہ ہے جبر و قہر کی وہ ہولناک فضا جو معاہدہ سوئز پر دستخط کیے جانے کے وقت مصر میں چاروں طرف پیدا کر دی گئی۔ بعد میں جب انگریزوں اور انقلابیوں کے درمیان زبانی طور پر اس معاہدے کی تفصیلات طے کی جا رہی تھیں، اس وقت دہشت و ترہیب کی شدتوں میں مزید اضافہ ہوا اور ملک کے طول و عرض میں وسیع پیمانہ پر پکڑ دھکڑ اور دار و گیر کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ان اسیران بلا پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ان کی ایک مثال یہ ہے کہ ٹریننگ کالج کے پروفیسر استاذ محمد عاطف کو مسلسل دس دن تک سونے نہیں دیا گیا اور ساتھ اتنی جسمانی تعذیب کی گئی کہ ان کی تین پسلیاں ٹوٹ گئیں، ان کا دماغ مختل ہو گیا اور آخر کار انہیں پاگل خانہ میں بند کر دیا گیا۔

اخوان کو صرف مصر کے حدود کے اندر ہی انواع و اقسام کے ظلم و عدوان کا شکار نہیں بنایا گیا بلکہ فوجی آمروں نے پوری کوشش کی ہے کہ اخوان مصر سے باہر بھی چین سے نہ بیٹھنے پائیں اور کہیں سے کوئی آواز آمریت کی مرضی اور مزاج کے خلاف اٹھنے نہ پائے۔ دوسرے ممالک میں اخوان کی موجودگی اور سرگرمیوں پر وہاں کی حکومتوں سے احتجاج کیا گیا۔ اور اخوان کے پانچ بڑے رہنماؤں کو جو مصر سے باہر چلے گئے تھے مصری قومیت اور شہریت سے محروم کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو ان کے اولین اور ابتدائی انسانی حق سے محروم کرنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا اور کوئی ادنیٰ عدالتی کارروائی بھی نہیں کی گئی۔ مصر کی تاریخ میں تو کیا پوری تاریخ عالم میں ایسے ظلم کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ بین المللی قوانین میں سے ایک متفق علیہ ضابطہ یہ ہے کہ کسی ملک کے شہری کو سنگین سے سنگین جرم پر بھی قومیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اپنے وطن کی خاک سے انسان کو اسی طرح کی پیدائشی نسبت ہوتی ہے جس طرح کی نسبت اسے اپنے والدین کی جانب ہوتی ہے۔ یہ ایک دائمی اور فطری رشتہ ہے جو کسی حال میں بھی زائل اور منفک نہیں ہو سکتا۔ حکومت شام نے جب ان مہاجرین اخوان کو اپنے ہاں سیاسی پناہ گزین قرار دیا تو اس پر بھی احتجاج کی آواز بلند کی گئی۔

جبر و تشدد کے اس بھیانک ماحول میں معاہدے پر آخری حرف تصدیق ثبت کیا گیا اور اب غالب امکان اسی امر کا ہے کہ پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا جائے گا اور ہر قسم کی جماعتی اور اجتماعی سرگرمیوں کا کلیۃً خاتمہ کر دیا جائے گا۔

جمال عبدالناصر پر حملہ ابھی دہشت ناک فضا ہے جس میں جمال عبدالناصر پر گولی چلنے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ اب از روئے

عدل و انصاف اس واقعہ کی ذمہ داری اخوان پر کس طرح ڈالی جا سکتی ہے، جب کہ اس کے قائدین میں سے بعض جیلوں میں ہوں بعض ملک بدر ہوں اور بعض کو اپنی آزادی اور جان کا خطرہ ہو۔ پھر اخوان کی تنظیم کا یہ حال ہے کہ وہ اب عوامی مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کی رکنیت لاکھوں کی تعداد تک پہنچ چکی ہے، اور ارکان کے علاوہ ان گنت افراد اس تحریک سے متاثر ہیں۔ ایسی تحریک اور تنظیم کو نظم وضبط کے حدود کے اندر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے معاملہ فہم اور مدبّر رہنماؤں کے لیے ہمیشہ اس بات کا موقع باقی رہے کہ وہ کارکنوں تک اپنی قولی، عملی اور تنظیمی ہدایات پہنچاتے رہیں۔ لیکن دہشت و آمریت کی فضا میں اس طرح کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر انقلابی مجلس کا یہ دعویٰ ہے کہ اخوان کی تنظیم تمام تخریبی اور تشدّد پسند عناصر پر مشتمل ہے اور اس کے پاس اسلحہ، بارود اور بموں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ بالفرض اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت کا تختہ الٹنے کا واحد طریقہ اخوان کے لیے بس یہ رہ گیا تھا کہ وہ قاہرہ سے پیدل اسکندریہ تک ایک آدمی کو بھیجے تاکہ وہ ہزاروں آدمیوں کے مجمع عام میں عبدالناصر سے بیس میٹر کے فاصلے پر کھڑے ہو کر پستول نکالے اور فائر کرنے کے بعد اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ حملہ آور گھر سے اخوان کی رکنیت کا فارم بھی پر کر کے اور جیب میں ڈال کر نکلا ہے تاکہ اس کی حیثیت غیر معلوم یا مشتبہ نہ رہے، بلکہ اچھی طرح مشخّص ہو جائے۔ خدارا بتایا جائے کہ کیا خونیں انقلاب برپا کرنے والوں کا اسلوبِ آغاز اور طریقِ کار اسی قسم کا ہوتا ہے؟ اگر انقلابی اخوان سے انصاف نہیں کرنا چاہتے تو کیا وہ عام عقلِ انسانی سے بھی انصاف روا نہیں رکھیں گے؟

اخوان کہتے ہیں کہ فاروق ایک مرتبہ پہلے یہی تہمت اخوان کے خلاف لگا چکا ہے۔ ان کی جماعت کو توڑ چکا ہے اور انہیں جیلوں میں دھکیل کر اذیتیں دے چکا ہے لیکن نتیجہ لوگوں کے سامنے ہے۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ عدالت نے آخر کار اخوان کو تمام الزامات سے بری قرار دیا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ تشدّد اور خونریزی کے واقعات کا باعث فقط شہری آزادیوں پر بندش اور جبر و استبداد تھا۔

مرکزِ اخوان میں آتش زدگی جمال عبدالناصر پر حملہ کے ساتھ ہی اخوان کے ہیڈ کوارٹرز کو جلا دینے کا واقعہ بھی رونما ہوا ہے جس کے بارے میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ غضبناک عوام نے عمارتوں پر دھاوا بول کر انہیں نذرِ آتش کر دیا ہے۔ آگ سارا دن جلتی رہی ہے حتیٰ کہ ہر چیز جل کر خاکستر ہو گئی ہے۔ اخوان کا جواب یہ ہے کہ یہ کارنامہ بھی حکومت نے ہیئۃ التحریر کے

ذریعہ سے خود سرانجام دیا ہے اور اس طرح کی حرکتوں کا نتیجہ قوم کے حق میں تباہی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ حکومت کے اس بیان کو بھی کون عقلمند باور کر سکتا ہے کہ آگ لگ جانے کے بعد عمارت کا بچانا حکومت کے بس کا کام نہیں تھا۔ آتشزدگی کے اس ڈرامے کی پوری ایکٹنگ ملٹری افسر حسین عرفہ نے اپنی نگرانی میں کرائی ہے۔ انہوں نے باب الحدید، قاہرہ میں خود کھڑے ہو کر مشاہدہ کیا ہے کہ ملٹری پولیس کے تقریباً ایک ہزار سپاہیوں نے کوتوالی سے نکل کر ان مصنوعی مظاہروں میں خود شرکت و قیادت کی ہے جو قاہرہ کی گلیوں میں انقلابیوں کے حق میں کئے گئے ہیں۔ یہی مظاہرین تھے جنہوں نے تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ "آزادی مردہ باد" کے نعرے لگائے ہیں۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے حسین عرفہ کی رہنمائی میں سٹیٹ کونسل کے اجلاس میں جا کر ہڑبونگ مچائی اور اس معزز مجلس کے احترام کو پامال کیا حتیٰ کہ صدر مجلس ڈاکٹر سنہوری پر بھی سنگینوں سے حملہ آور ہوئے۔ اور اگر ڈاکٹر سنہوری شجاعت کا ثبوت نہ دیتے اور اپنی مدافعت میں فائر نہ کرتے تو وہ یقیناً قتل کر دیے جاتے۔ یہ سب کچھ حسین عرفہ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، مگر اس نے فسادیوں کو ان ناپاک عزائم و افعال سے روکنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ یہی لوگ تھے جو نمائش اور مکر و فریب سے کام لے کر اس قسم کے نعرے بھی بلند کر رہے تھے کہ "ہمیں شہری آزادیوں کی نہیں بلکہ پولیس اور فوجی راج کی ضرورت ہے"۔ یہی لوگ تھے جو بس سٹاپوں، گاڑیوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ہو کر پر امن شہریوں کو نقل و حرکت سے روکتے رہے ہیں اور پستول دکھا دکھا کر انہیں دھمکاتے اور بھگاتے رہے ہیں حتیٰ کہ ٹریفک بالکل معطل ہو گیا۔ پھر یہی لوگ تھے جنہوں نے میدان الحلمیہ کا رخ کیا تاکہ وہاں اخوان کے مرکز عام اور ملحقہ عمارت کو آگ لگائیں۔ جب یہ آگ لگا دی گئی تو عام پولیس اور فائر بریگیڈ کے آدمیوں کو جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ جلتے ہوئے مکانات کے قریب آئیں۔ وجہ بالکل ظاہر تھی ان کو پیشگی ہدایات دی گئی تھیں کہ مداخلت نہ کریں۔ یہ آگ دن بھر بھڑکتی رہی اور اس کی زد سے سامان کتب حتیٰ کہ انسانی جانوں کے بچانے کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی گئی۔ نہ ہی چاروں طرف جمع شدہ عوام کو ایسا کرنے دیا گیا، یہ ہے وہ حکومت جو ملک میں امن و امان کے قیام و بقا کی مدعی ہے۔

اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب کہ اخوان کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور ان کی تمام املاک، جائدادیں، شفاخانے دفاتر اور ادارات ضبط کر کے ھیئۃ التحریر کے سپرد کر دئے گئے۔ ایسے ظلم اور زیادتی کی مثال مصر کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ ان مظالم کے مرتکبین کو یاد رکھنا چاہیے کہ اخوان کے قلوب میں ایمان و عقیدہ کی جو زندگی اور

گرمی موجود ہے اسے شمشیر اور بندوق کے زور سے نہیں مٹایا جاسکتا۔ اخوان کی جماعت کو توڑ دینے، انہیں جیلوں میں ٹھونسنے، ان کی مملوکات کو ضبط کرنے، انہیں طرح طرح کے عذاب دینے، انہیں تختۂ دار پر لٹکا دینے کے باوجود ظالم اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے اور یہ ساری ستم ایجادیاں ظلم کی ناکامی اور خسران کا موجب ہوں گی۔ فاروق اپنے لاؤلشکر کے ساتھ یہ سارے حربے آزما چکا ہے مگر آج وہ کہاں ہے؟

فوجی عدالتیں انقلابی کونسل نے اخوان کو خلاف قانون قرار دینے کے بعد نام نہاد فوجی عدالتیں بھی قائم کی ہیں کہ وہ اخوان کے خلاف مقدمات کی سماعت کریں۔ یہ ظلم و عدوان کا ایک دوسرا اعظم عنوان ہے۔ قانون و انصاف کے کس تصور کی رو سے یہ جائز ہے کہ مدعی اور دشمن خود قاضی اور جج بن کے بیٹھ جائے؟ اور دشمن بھی کونسا جس نے پہلے سے مدعا علیہ کو کشتنی اور گردن زدنی قرار دے دیا ہے اور اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کا ارادہ ظاہر کردیا ہے۔ پہلی عدالت کا صدر جمال سالم ہے جو اپنے چھچھورپن اور کم ظرفی میں ضرب المثل ہے۔ اس کے ارکان انورالسادات اور حسین شافعی ہیں جو پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ سے اخوان کو گالیاں دینے میں رسوائے عام ہوچکے ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے ہیں کہ سادات نے روزالیوسف میں (جمال پر حملہ سے قبل ہی) یہ کہا کہ اخوان خائن ہیں انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور شافعی نے ایک تقریر میں جو سارے پریس میں چھپ چکی ہے، یہ گل فشانی فرمائی ہے کہ مفسد اور فتنہ پرداز اخوان جہاں بھی ملیں انھیں پکڑو اور مارو۔ یہ "قاضی" جو مدعا علیہ کے بارے میں پیشگی فیصلے کا اعلان کرچکے ہیں، کیا انہیں ازروئے عقل و انصاف یہ حق کبھی بھی پہنچ سکتا ہے کہ یہ "عدالت" جما کر بیٹھیں، اور اسی مدعا علیہ کے خلاف مقدمہ سنیں؟ اگر اخوان کے خلاف، جیسا کہ انقلابیوں کا دعویٰ ہے سنگین جرائم کا ثبوت موجود ہے، تو اسے عام ملکی عدالتوں میں کیوں نہیں لایا جاتا؟ کیا انہیں عدالتوں پر اعتماد نہیں ہے، یا وہ ڈرتے ہیں کہ اخوان کے حق میں کہیں ویسا ہی انصاف نہ ہوجائے جیسا کہ ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا؟ اس وقت بھی اخوان کو خلاف قانون قرار دیتے وقت پورا مصری پریس اسلحہ کے ذخائر اور سینکڑوں ٹن ڈائنامیٹ اور سازشوں کے افسانوں سے گونج اٹھا تھا۔ آخر کار ۱۹۵۲ء میں عدالت عالیہ نے اخوان کو ان تمام الزامات سے باعزت طریقے پر بری کردیا تھا اور عدل و انصاف کی ایک قابل تقلید نظیر پیش کردی تھی، بلکہ اس عدالت عالیہ کا صدر جب چند ماہ بعد ریٹائر ہوا تو وہ سیدھا اخوان کے دفتر میں پہنچا اور اس نے اخوان کی رکنیت کے رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے کہ "کنت احاکمھم فاصبحت منھم (ایک وقت وہ تھا کہ میں

اخوان کے مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا اور ایک وقت یہ ہے کہ میں انہی میں سے ایک ہو گیا ہوں)۔

اصل بنائے نزاع کیا ہے؟ بہت سے لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ جمال عبدالناصر اور اس کے حواریوں میں اخوان کے خلاف اتنی عداوت اور اتنا بغض و عناد کیوں ہے؟ اخوان کا جواب یہ ہے کہ اس عداوت و عناد کے دو بڑے وجوہ ہیں ایک وجہ داخلی ہے اور وہ جمال کے مزاج کی فرعونیت اور تمرد ہے۔ وہ ایسی خدائی کا ڈنکہ بجانا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی اسے مشورہ دے نہ کوئی اس سے اختلاف کرے اور نہ کوئی اس کے سامنے سر اٹھائے۔ جنرل نجیب کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا وہ اس کی واضح مثال ہے۔ پھر جمال نے اپنے فوجی دوستوں کے ساتھ بھی یہی کیا ہے۔ کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پھینک دیا ہے۔ کسی کو سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا ہے اور کسی کو منصب و ملازمت سے معزول کر دیا ہے اس کی مثال لفٹننٹ کرنل رشاد مہنا ہے، جس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت و صلاحیت کا مالک اور فوجی افسروں میں نہایت ہر دلعزیز ہے۔ اس "روشنیٔ طبع" کی سزا اسے حبس دوام کی شکل میں ملی ہے۔ صرف رشاد ہی کا نہیں بلکہ رشاد کے بہت سے مداحوں کا بھی یہی انجام ہوا ہے اور اب جمال عبدالناصر کے گرد سارے وہ لوگ جمع ہیں جو خوشامدی، چاپلوس اور جی حضوریے ہیں۔ جب عام افراد کے بارے میں عبدالناصر کی روش یہ ہے تو بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخوان کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہوگا جس کے نوجوان صرف خدا کی بندگی کرتے ہیں اور صرف حق کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔

فوجی آمریت کے مزاج کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی ایسی تنظیم یا تحریک کو برداشت نہیں کر سکتی جو اس کے احکام کی بے چون وچرا تعمیل نہ کرے۔ چنانچہ قاہرہ یونیورسٹی کے چالیس ایسے پروفیسروں کو علیحدہ کر دیا گیا ہے، جنہوں نے محض علمی حیثیت سے معاہدۂ سویز سے اظہار اختلاف کیا ہے۔ انقلابیوں کے اخوان کے مخالف ہونے کی ایک اور داخلی وجہ انقلابیوں کا اسلام سے انحراف ہے۔ انقلابی مجلس بے دینی اور بے حیائی کے سیلاب کا مصر میں نہایت تیزی سے راستہ ہموار کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسلام کو رجعت پسندی کا نام دے کر بار بار ہدف ملامت بنا رہی ہے اس مجلس کے ارکان کے مشاغل کی ایک جھلک ہم پہلے دکھا چکے ہیں۔ نام نہاد انخلائے سویز کے نام سے ملک بھر میں جو جشن منانے کا پروگرام بنایا گیا تھا، ان میں کاریوکا، سامیہ جمال اور اسی طرح کے دوسرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بلایا گیا اور کونسل کے ممبروں نے ان پروگراموں میں خود شمولیت کی اور ناچنے اور گانے والوں اور والیوں کے گرد بیٹھ کر

تالیاں بجائیں۔ ان اعمال کے ساتھ ساتھ اسلام کے خلاف ان لوگوں کی قولی تصریحات کو اگر کوئی ملاحظہ کرنا چاہے تو اخبار "التحریر" کا وہ پرچہ دیکھ لے جو تین ہفتے قبل شائع ہوا ہے اور جس میں کمانڈر صلاح سالم نے ایک مضمون اس عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اخوان مصر میں کیسی حکومت چاہتے ہیں؟ اس میں کہا گیا ہے کہ اخوان کا ارادہ یہ ہے کہ "سود" کو حرام کر دیا جائے، چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں، زانیوں پر کوڑے برسائے جائیں، اور بنکوں کے نظام کو لپیٹ دیا جائے۔ فوراً نہیں تو کم از کم تدریجاً اخوان یہی کچھ کرنا چاہتے ہیں" پھر سالم فرماتے ہیں کہ قوم مطمئن رہے کہ ہم قوم اور اس کے مستقبل کے محافظ ہیں۔

دوسرا اور خارجی عنصر جو اخوان اور فوجیوں میں باہمی کشمکش کا باعث ہے وہ انیگلو امریکی مکرو سیاست ہے۔ اینگلو امریکی بلاک نے اب مصر کے حکمرانوں کو اپنے مصالح کے بالکل تابع بنا لیا ہے اور آئندہ جنگ کے لیے ایک خیمہ بردار کی حیثیت سے اپنی دم کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک سال سے جمال عبدالناصر اس بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ مغربی طاقتوں کا حلیف بننا ناگزیر ہے اور مصر کی اقتصادی مشکلات کے لیے امریکی امداد لیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ جمال عبدالناصر نے امریکہ میں اپنے سفیر ڈاکٹر احمد حسین کی وساطت سے امریکہ سے امداد کی باقاعدہ درخواست کی ہے۔ امریکہ نے اس کے لیے تین شرائط پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزوں سے سویز کے بارے میں معاہدہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ اسرائیل سے صلح کی جائے اور تیسرے یہ کہ الاخوان المسلمون اور اشتراکیوں کا مصر میں خاتمہ کر دیا جائے۔

ساری دنیا کو معلوم ہے کہ ان شرائط میں سے کچھ پوری کی جا چکی ہیں اور بقیہ کی تعمیل کی جا رہی ہے۔ انگریزوں سے معاہدہ اس شرط پر ہو چکا ہے کہ انگریز جب بھی سمجھیں گے کہ مصر یا کسی دوسرے عربی ملک یا ترکی کو خطرہ لاحق ہے تو وہ فوراً نہر سویز میں اپنی فوجیں اتار دیں گے۔ برطانیہ اور امریکہ کو اس سے زیادہ کیا مطلوب ہو سکتا ہے؟ اسرائیل کے نمائندوں سے کونسل کے ارکان کی ملاقاتوں کی روداد اخوان پہلے نشر کر چکے ہیں۔ صلاح سالم، احمد حسین اور محمود عزمی اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ اسرائیل کے خلاف ہم ہرگز معاندانہ یا جارحانہ ارادے نہیں رکھتے۔ اخوان اور دوسرے مصری شہداء کے خون سے فلسطین کی سرزمین ابھی تک لالہ زار بنی ہوئی ہے اور انقلابی کونسل کے ارکان یہ نیا راگ الاپ رہے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر صدمے کا باعث محمود عزمی کا وہ انکشاف ہے جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے کیا ہے کہ مصر کی اجازت سے اٹھارہ اسرائیلی سٹیمر سویز سے گزر کر حیفہ پہنچے ہیں اور باون اسرائیلی

جہاز حیفہ سے اسرائیلی مصنوعات کو لاد کر اور سویز سے گزر کر دنیا کی مختلف منڈیوں میں جا چکے ہیں۔ عربی ممالک کی حکومتیں جو مصری حکومت سے مل کر اسرائیل کے مقاطعے کی تدابیر سوچ رہی تھیں وہ اس انکشاف کو دیکھ کر دنگ رہ گئی ہیں۔ انگریزوں اور یہودیوں سے صلح صفائی کے بعد اب امریکی امداد کا معاہدہ بھی عمل میں لایا جا رہا ہے۔

"اخوان کی دعوت نہیں مٹ سکتی" آخر میں اخوان یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ عالم عرب اور عالم اسلام کے خلاف ہر سازش اور ہر ضرب کا وہ اپنے تنے ہوئے سینوں سے مقابلہ کریں گے۔ اخوان یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جس دعوت پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس ایمان کی آگ دنیائے عرب کے لاتعداد شہروں اور دیہات کے لاکھوں نوجوانوں کے قلوب میں سلگ رہی ہے۔ اس ایمان کو ان کی ماؤں نے اپنے دودھ کے ساتھ اخوان کی رگوں میں اتارا ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس ایمان کو محو کرنے میں انشاءاللہ کامیاب نہیں ہوگی۔ اخوان اس داستان خونچکاں کو قرآن کے ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے)

(بقیہ از صفحہ ۷۲)

واجبات کو فوراً مشروط اور مقید بھی کر دیتی ہے۔ حکومت کے لیے کسی ملازم یا غیر ملازم کو مخالفِ اسلام احکام دینا جائز نہیں ہے اور اسی طرح مامور کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ آمر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوئے کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق اور من امرکم من الولاة بغیر طاعة اللہ فلا تطیعوہ (مخلوق کی اطاعت خالق کی معصیت میں جائز نہیں اور حکام میں سے جو تمہیں اللہ کی فرمانبرداری کے خلاف حکم دے تو اس کی اطاعت مت کرو) (باقی)

اسلام اور ہمارا قانونی نظام

ذیل میں ہم عبدالقادر عودہ رحمۃ اللہ (اخوان کے نائب مرشد جنہیں حال ہی میں مصر کی فوجی حکومت نے پھانسی پر لٹکایا ہے) کی ایک کتاب "الاسلام واوضاعنا القانونیہ" میں سے ابتدائی حصے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ عبدالقادر عودہ مرحوم و مغفور مصر کے ایک ممتاز قانون دان تھے جو ۱۹۵۱ء تک جج رہ چکے ہیں اور جو بعد میں مستعفی ہوگئے تھے۔ آپ ایک نہایت سنجیدہ، متین اور علمی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ اسلام کے پُرجوش داعی اور مسلمانوں کے سچے خادم تھے۔ اسلامی فقہ و قانون میں آپ کی نظر نہایت وسیع تھی، جس کا ثبوت آپ کی کتاب "التشریع الجنائی الاسلامی" ہے جس کا صرف پہلا حصہ سوا آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مقدمے کا ترجمہ "ترجمان" میں پیشتر شائع ہوچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کی راہ میں شہادت ایک ایسا مرتبہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی سرفراز فرماتا ہے، تاہم ان تازہ حادثات کے بعد ہر سوچنے والے انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ وہ کونسا سنگین جرم ہے جس کی پاداش میں ایسی قیمتی جانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ اس سوال کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف جوابات دئیے جا رہے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر ایک منصف مزاج آدمی عبدالقادر شہید کے قلم سے نکلے ہوئے ان چند صفحات کو پڑھ لے گا، تو اسے مذکورہ بالا سوال کا جواب معلوم کرلینے میں کچھ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس کا دل گواہی دے گا کہ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (الآیۃ) اس مضمون کو پڑھنے والا خود پکار اٹھے گا کہ یہ وہ کلمۂ حق ہے کہ جو ـــ بردار نتواں گفت، بہ منبر نتواں گفت۔

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد رسول اللہ۔ اللھم اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وارلط علی قلوبنا وآتنا نصرک الذی عدتنا

موجودہ قانون سے معذرت | سب سے پہلے میرے لیے ضروری ہے کہ میں قانون ملکی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر

واضح کر دوں۔ اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک جج کے میں اس قانون کی محافظت، مدافعت اور تنفیذ کا ذمہ دار ہوں اور مجھ سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ میں اس قانون کی، جیسا کچھ بھی یہ ہے، صرف تعبیر اور تطبیق کروں، اس کے استحکام کے لیے کوشش کروں اور اسے توہین و تذلیل سے بچاؤں۔ لیکن قانون ہی کی خاطر اور اس کی خدمت کے جذبے ہی کے تحت میرا ارادہ ہے کہ میں موجودہ قوانین پر تنقید کروں۔ میں قانون کی موجودہ ہیئت پر تو ضرور اعتراض کروں گا لیکن قانون کی "روح اور اس کی حقیقت" کی ہرگز مخالفت نہیں کروں گا۔ میری اس بحث کا اگر ایک نتیجہ یہ بھی نکلے کہ قوانینِ موجودہ کے تقدس و کمال کا تصور لوگوں کے دلوں میں قائم نہ رہے اور وہ اس کی اصلاح و تکمیل کے لیے کمربستہ ہو جائیں، تو یہ نفسِ قانون کی صحیح معنوں میں ایک خدمت ہوگی اور اس سے میری تنقید کے لیے بھی ایک معقول وجہِ جواز فراہم ہو جائے گی۔

اظہارِ خیال قانوناً ممنوع ہے | موجودہ قوانین کی رو سے ملازمین حکومت اور خصوصاً عدلیہ کے کارکنوں کے لیے مسائلِ عامہ پر اظہارِ رائے کرنا حرام ہے۔ اسے "سیاسی سرگرمی" کا نام دے کر غیر قانونی فعل قرار دے دیا گیا ہے۔ قانون کے بنانے والوں نے ان "سیاسی مسائل" کی فہرست میں تمام سیاسی، اقتصادی، مالی اور معاشرتی معاملات کو شامل کر رکھا ہے حتیٰ کہ ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق فرد، جماعت، قوم، قومی آزادی اور قومی عزت و شرف سے ہے یا جس کا تعلق نظامِ حکومت اور بین الاقوامی معاملات سے ہے، وہ از روئے قانون ایک ملازم حکومت کے لیے اظہارِ خیال کا موضوع نہیں بن سکتا۔ موجودہ قانون کے مصنفین کا منشا یہ ہے کہ جیتا جاگتا اور سوچتا سمجھتا انسان ایک بے جان اور بے حس مشین بن کے رہ جائے، وہ آنکھیں بند کر لے اور دیکھنا چھوڑ دے، کان بند کر لے اور سننا چھوڑ دے، زبان بند کر لے اور بولنا چھوڑ دے، اپنے شعور، احساس اور فکر کو بالکل معطل اور مفلوج کر دے۔

کیا ایسا تجرد و تعطل ممکن ہے؟ | مگر کیا "لب بند و گوش بند و چشم بند" کی اس روش پر کاربند ہونا انسان کے لیے عقلاً اور عملاً ممکن ہے؟ مثلاً کیا ایک جج کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ جذبات و احساسات سے بالکل عاری ہو جائے حالانکہ وہ دن رات اجتماعی مسائل سے دوچار ہوتا ہے؟ وہ مختلف افراد کو اور جماعتوں کو زندگی کے میدان میں ایک وسیع کشاکش اور آویزش میں مبتلا دیکھتا ہے، وہ محروم لوگوں کو مصائب کا شکار ہوتے دیکھتا ہے، وہ مظلوم محنت کاروں کی آہیں سنتا ہے، وہ اجتماعی غربت و افلاس، معاشی ظلم و جور، سیاسی ناانصافی اور جبری استحصال کے دردانگیز مناظر کا

صبح و شام مشاہدہ کرتا ہے۔

جس قوم کے سینے پر اجنبی تسلط کابوس بن کر سوار ہو، ـــ ایسا تسلط جو پورے وطن پر چھایا ہوا ہو، جو رزق کے سارے سرچشموں پر قابض ہو، جو ملک کی ساری دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہو، جو اس کی آزادی کو پامال کر رہا ہو، جو اس کی داخلی اور خارجی سیاست کو اپنا تابع فرمان رکھنا چاہتا ہو، جو نیک طینت اور باضمیر ابنائے قوم کے خلاف ان کے ایسے بھائیوں کو استعمال کر رہا ہو جنہوں نے شیطان کے ہاتھ اپنی جان، دین اور وطن کو فروخت کر دیا ہو، جس قوم کے بوڑھوں اور جوانوں نے اس طرح کے اجنبی تسلط میں آنکھیں کھولی ہوں اور اسی کے دور میں اپنی آنکھیں بند کر رہے ہوں، کیا ایسی قوم کا جج محض ایک غیر جانبدار تماشائی بن کے اپنی زندگی گزار سکتا ہے؟ جس ملک کی عزت کو غیر ملکی استعمار نے خاک میں ملا دیا ہو، اس کی آزادی کو پامال کر رکھا ہو، مادی اور اخلاقی حیثیت سے اُسے بالکل فرو مایہ اور دیوالیہ بنا کر چھوڑ دیا ہو، اُس کے گوشے گوشے میں فساد برپا کر دیا ہو، اس کے بسنے والوں میں ایک کے اندر دوسرے کے خلاف بغض و عناد پیدا کر دیا ہو، انہیں ایسی منفرق ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہو، جن میں سے ہر ٹولی اپنے ہی حال میں مست ہو، جس کے افراد بظاہر متحد نظر آتے ہوں مگر جن کے دل ایک دوسرے سے پھٹ چکے ہوں، جس ملک کی نسلیں اجنبی استبداد کے خلاف کشمکش میں ختم ہو رہی ہوں، جس ملک کے سامنے آزادی کامل یا مرگِ ذلت آمیز کا سوال درپیش ہو، لیکن جس کے شہریوں کا یہ حال ہو کہ بھی غیر ملکی سامراج اگر انہیں چند کرسیاں مستعار دے دے تو وہ شہری ان کرسیوں کی بر جان ہو کر ایک دوسرے سے لڑنا، ایک دوسرے کی گردنیں مارنا اور ایک دوسرے کا خون بہانا شروع کر دیں، کیا ایسے ملک کی عدالتوں کا کوئی جج ان ہنگامہ ہائے رست و خیز سے اور ان غلغلہ ہائے دارو گیر سے الگ تھلگ رہ سکتا ہے؟

جج لاقانونیت کا تماشائی بن کے نہیں رہ سکتا | کیا ایک جج کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرے، جہاں ملزمین سے کردہ یا ناکردہ خطاؤں کا اعتراف کرانے کے لیے اُن کے ناخن گوشت پر سے اُکھڑوا دیے جائیں، انہیں بار بار اس طرح سے پیٹا جائے کہ وہ ہر مرتبہ بیہوش ہو جائیں، ان کے جسم آگ سے داغے جائیں، ان کی کھالیں کوڑوں سے ادھیڑ دی جائیں، انہیں کھانے، پینے اور دوا سے محروم کر دیا جائے، اُن کی حیا کو ننگا کر کے مجروح کیا جائے، اُن کے بدن کے پوشیدہ مقامات میں لکڑیوں اور لوہے کی سلاخوں کو داخل

کیا جائے، انہیں دھمکیاں دی جائیں کہ ان کی ماؤں، بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جائے گا اور پھر ان ملزمین کے گھروں میں پولیس کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے گھسی رہے جب کہ وہاں عورتوں کے علاوہ کوئی نہ ہو، قانون کے نگہبانوں کو ان تمام حالات یا ان میں سے بیشتر حالات کا علم ہو مگر وہ اس بارے میں کوئی ادنیٰ ترین کارروائی بھی نہ کریں۔ پھر ان تمام شرمناک اور انسانیت سوز مظالم کو عدالتوں کے نوٹس میں لایا جائے، مظلوم عدالت میں خود پیش ہو کر یہ تمام واقعات اپنی زبان سے دہرائیں، باقاعدہ دستاویزات اور طبی سندات شہادت میں پیش کی جائیں لیکن حکومت ان زیادتیوں کی تحقیق و تفتیش کے لیے اور قانون اور محافظینِ قانون کی ساکھ کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھانے پر بھی آمادہ نہ ہو۔

کیا ایک جج کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی دنیا میں بالکل بے تعلق ہو کر رہے جہاں قانون کا احترام بالکل ختم کر دیا گیا ہو اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہو، جہاں قانون بیچارہ لوٹ کھسوٹ اور مظالم کے جواز کا آلہ بن کے رہ گیا ہو، جہاں حکومت کے مناصب اور ہر طرح کے فوائد سے صرف وہ لوگ متمتع ہو سکتے ہوں جو حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں، جہاں نفاق کامیابی کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہو اور اباحیت و بداخلاقی کو جاہ و منزلت کی اولین شرط سمجھا جاتا ہو؟ کیا ایک جج اس بات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے وطن میں عہد جاہلیت کے سے حالات کا دور دورہ ہو، زبردست اپنا خون پسینہ ایک کر کے کمائیں اور زبردست اسے چین اور مزے سے بیٹھ کر کھائیں، کمزور کو اپنے جسم اور روح کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے سوکھا نوالہ اور میلا چیتھڑا بھی میسر نہ ہو اور طاقتور سونے اور چاندی سے کھیل رہا ہو۔ اگر کمزور شکایت کرے تو قانون اس کے خلاف حرکت میں آجائے، حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ کمزور اپنے ماحول اور قانون مروّج کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دے۔

جج دین سے انحراف کو بھی خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا | پھر کیا ایک جج اس بات کو بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے کہ ایک ملک کے دستور میں تو یہ دفعہ درج ہو کہ ریاست کا دین اسلام ہے لیکن اس کی حکومت اور حکمران اسلام کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کریں، خادمانِ اسلام کے خون کے پیاسے بن جائیں، تعاون علی البرّ والتقویٰ کی خواہش رکھنے والوں کو نشانۂ ستم بنالیں اور تعاون علی الاثم والعدوان کے مرتکبین کی سرپرستی کریں؟ کیا

ایک جج ایسے حالات میں ناطرفدار رہ سکتا ہے جب کہ پورا ملک اخلاقی فضائل ومحاسن سے عاری ہوتا جا رہا ہو، دیانت اور حسنِ اخلاق کا نام ونشان مٹ رہا ہو اور لوگ موجودہ لیڈروں کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دینے لگے ہوں؟

جج غیر جانبدار کب رہ سکتا ہے؟ جج صرف اس قوم کے اندر غیر جانبداری کا موقف اختیار کر سکتا ہے، جہاں ابنائے قوم اپنے قانون کا لفظاً اور معناً احترام کرتے ہوں اور ضعیف اور قوی یکساں طور پر اس کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوں۔ لیکن جس قوم کا یہ حال ہو کہ وہ ایک دین کو قبول کرے اور پھر اس پر کاربند نہ ہو، قوانین بنائے اور پھر انہیں نافذ نہ کرے، حق، عدل اور انصاف کی علمبرداری کا دعویٰ کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے، جو قوم تواصی بالحق دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام نہ دے، اس قوم کا جج اگر بے تعلق اور غیر جانبدار رہنا بھی چاہے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔

بہت سی جبینیں ایسی ہیں جن پر ان سطور کے پڑھ لینے کے بعد شکن پڑ جائیں گے، بہت سے چہرے ایسے ہیں جو غضب آلود ہو جائیں گے لیکن میں ان صنم پرستوں سے کہتا ہوں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے یہ سارے قوانین وضوابط عصرِ حاضر کے لات ومنات ہیں، ان کی اطاعت کر کے ایک مسلم اپنے اللہ کو ناراض کرتا ہے۔ ان کی وساطت سے مسلمانوں کی حکومتیں اللہ کے حلال کو حرام اور اللہ کے حرام کو حلال کر رہی ہیں۔

ان بتوں کے پجاریوں کو یہ بات غیظ اور غصے میں مبتلا کر دے گی کہ اس بت خانے کے ایک کاہن نے ان بتوں کے خلاف کفر وبغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ ان لوگوں کو حیرت ہو گی کہ قانونِ موجودہ کے خادموں میں سے ایک خادم نے ایسی غداری کیوں کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہر طرف سے آواز بلند ہو گی "لوگو! اپنے بتوں کی نصرت وتائید کے لیے اٹھو، اس شخص کو پکڑ لو، قبل اس کے کہ یہ تمہارے بتوں کو چکنا چور کر دے اور تمہارے نظام کو درہم برہم کر دے"۔ لیکن یاد رکھو! اس بغاوت کو دبانا ناممکن ہے، یہ ایک شخص کا دعویٰ یا نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی دلی تمنا ہے۔ یہ صدائے لسان نہیں بلکہ ندائے ایمان ہے، یہ اسلام کی راہ میں ایک کشمکش ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، اسی رستے سے ہم اللہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

میں جج ہوں لیکن مسلمان ہوں اگر میں ایک غیر مسلم جج ہوتا تو میری زبان قوانین حاضرہ کی حمد میں اسی طرح تر ہوتی جس طرح یورپ والوں کی زبانیں ہیں! اگر میں ایک جاہل مسلمان ہوتا تب بھی میں مغربی اقوام کی تقلید کرتا اور اس قانون پر ایمان لے آتا

لیکن مجھ پر اللہ کا یہ فضل ہے کہ میں ایک ایسا مسلمان جج ہوں جسے بہت سے مسلمان ججوں سے زیادہ اسلام کا علم حاصل ہے اور مجھے موجودہ قوانین اور قوانین شرعیہ کے باہمی اختلاف سے جس حد تک واقفیت ہے، اس حد تک واقفیت بہت تھوڑے سے قانون دانوں کو حاصل ہے۔

میری غیر جانبداری کفر ہے موجودہ قانون شخصی معاملات، اجتماعی مسائل، نظام حکومت، فوجداری و دیوانی قوانین، اخلاقیات، سماجی عدل، حقوق و واجبات، بین الاقوامی تعلقات، سب سے بحث کرتا ہے۔ ان سارے مسائل کے بارے میں ایک مسلمان جج خالی الذہن اور جانبداری سے ماوراء اسی شکل میں ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ اسلام کو ترک کرکے کفر کا انتخاب کرلے اور یا پھر گونگے اور بے عقل جانوروں کی طرح حیوانی زندگی بسر کرے۔ مسلمان کا دستورِ اساسی شریعت اسلامی ہے۔ قوانین موضوعہ میں سے جو قانون نصوصِ شریعت کے مطابق ہے یا اس کی روح اور مبادیات کے موافق ہے اسے ایک مسلمان بسروچشم قبول کرے گا اور امر الٰہی کے موجب اس کی دل سے اطاعت کرے گا۔ جو قانون اس کے خلاف ہوگا مسلمان اسے پاؤں کے نیچے روندے گا۔ اسلام کی مخالفت کرکے کسی شئے کا احترام نہیں کیا جاسکتا۔ کسی مخلوق کی ایسی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی جس سے اللہ کی نافرمانی لازم آئے۔ ایک مسلمان اگر حرام کو حرام تسلیم کرتے ہوئے اس کا مرتکب ہے وہ فاسق ہے، لیکن اگر وہ حرام کو حلال اور جائز سمجھتے ہوئے اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کا کافر اور اسلام سے مرتد ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ایک سچا مسلمان خدا یا خلق کے سامنے فسق و کفر کی ان دونوں حالتوں میں سے کسی حالت میں اپنے آپ کو پیش کرنا گوارا نہیں کرسکتا۔

لاطاعۃ فی معصیۃ اللہ اسلام مسلمانوں پر واجب کرتا ہے کہ اولاً وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور ثانیاً اولی الامر کی اطاعت کریں۔ اسلام مسلمان پر یہ بھی واجب کرتا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی غیر اللہ کی اطاعت نہ کریں۔ پس اولی الامر کی کوئی ایسی اطاعت جائز نہیں جو اللہ کے دائرۂ اطاعت سے مسلمان کو خارج کردے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء ۵۹)

یہ آیت حکام کو امر کا حق دیتی ہے جس کی اطاعت محکوم پر واجب ہے لیکن ساتھ ہی یہ آیت حاکم کے حقوق اور محکوم کے

(بقیہ صفحہ ۶۶)

آج کے بچے کل کے رہنما ہیں

اگر کسی ملک کے مستقبل کا اندازہ کرنا ہو تو اسکے بچوں کو دیکھا جاتا ہے کہ انکی اٹھان کس نہج پر ہو رہی ہے بچوں کے ذہن پر بچپن میں جو نقش بٹھا دیئے جاتے ہیں آئندہ زندگی میں وہی انکی سیرت و کردار کی بنیاد بنتے ہیں۔ اگر آپ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کے دل و دماغ کو اسلام کے رنگ میں رنگیئے ۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اس مبارک کام میں آپکی امداد و رہنمائی اور بچوں کی اسلامی و اخلاقی تربیت کے لئے نہایت سادہ دلنشین اور موثر پیرایہ میں۔ لکھی ہوئی حسب ذیل چیزیں پیش کرتا ہے ۔

بچوں کے لئے اصلاحی و اخلاقی کہانیاں

آسان کہانیاں	. • .
اخلاق کہانیاں پہلا حصہ	. • .
اخلاق کہانیاں دوسرا حصہ	. • .
اخلاق کہانیاں تیسرا حصہ	. ٤ .
اخلاق کہانیاں چوتھا حصہ	. ٤ .
مجاھد کی ڈائری	. • .
کون ہے راجا	. • .
سچ ہے ہوئی سچ ہے	. • .
ھاضمے کا چورن	. ٥
سورج کا پیام	. • .
طوطوں کی رٹ	• •
رحمت کا فرشتہ	. • .
دس سیر لکڑیاں	. • .
بھوک	. • .
سچی کامیابی	. • .
ایک حویلی	. • .
حسناتی نظمیں پہلا حصہ	. • .
حسناتی نظمیں دوسرا حصہ	. • .
مرغ کا سالن	. ٥ .

قرآنی قصے بچوں کی زبان میں

غار والے	. • .
کاؤں والے	. • .
سنیچر والے	. • .
اللہ میاں کی اونٹنی	. • .
جنت سے زمین پر	. • .
بیٹے کو نصیحت	. • .

اللہ کے پیارے نبیوں کے مختصر حالات

سادہ اور دلنشین زبان میں

نبیوں کے حالات حصہ اول (حضرت آدم سے حضرت ہود تک)	. ٥ .
نبیوں کے حالات حصہ دوم (حضرت صالح سے حضرت لوط تک)	. ٨ .
نبیوں کے حالات حصہ سوم (حضرت یوسف علیہ السلام)	. ٨ .
نبیوں کے حالات حصہ چہارم (حضرت موسیٰ)	١ ٨ .
پیارے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)	. ٨ .

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاھور

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف : مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہوسکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:-

تفسیر آیۃ بسم اللہ ' تفسیر سورۂ فاتحہ ' سورۂ ذاریات' سورۂ قیامہ ' سورۂ تحریم سورۂ عبس' سورۂ و الشمس' سورۂ و التین' سورۂ و العصر' سورۂ فیل' سورۂ کوثر' سورۂ کافرون' سورۂ لہب' سورۂ اخلاص۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انمیں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۲۵۷ صفحات $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس۔ جلد عمدہ کپڑے کی .... قیمت: چودہ روپے

رسائل و مسائل حصہ دو

کی

طباعت مکمل ہو چکی ہے اور اس کی فرمائشونکی تعمیل کی جاری ہے پہلا ایڈیشن تھوڑی تعداد میں چھپا ہے اسلئے خواہشمند حضرات جلد از جلد اپنی فرمائشیں ارسال کر دیں

ضخامت ۳۲۶ صفحات قیمت سات روپے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور

... جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا